# دنیا کو اسلام سے کس کس طرح روکا گیا





حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ

# دُنیا کو
# اِسلام سے کِس کِس طرح روکا گیا؟

شیخ الادب حضرت مولانا محمدؐ اعزاز علی صاحبؒ

اِدارۃُ المعارِف کراچی ۱۴

طبع جدید: شعبان المعظم ۱۴۱۹ھ۔ دسمبر ۱۹۹۸ء
باہتمام: محمد مشتاق سنی
مطبع: احمد پرنٹنگ کارپوریشن کراچی

ناشر: ادارۃ المعارف کراچی ۱۴
پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰ فون: ۵۰۶۰۷۲۷

سرورق: رشید شاہد

ملنے کے پتے: ادارۃ المعارف کراچی نمبر ۱۴
دارالاشاعت اردو بازار کراچی نمبر ۱
ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور

# فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

# پیش لفظ

از

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم
صدر جامعہ دارالعلوم کراچی

مستشرقین نے اسلامی جہاد کو بدنام کرنے کے لئے یہ نعرہ عرصہ دراز سے چلتا کیا ہوا ہے کہ دنیا میں اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے اور اسلامی جہاد کا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا جائے ــــ زبردستی کی یہ بات قرآن وسنت کی تعلیمات کے بھی بالکل منافی ہے اور واقعات کے بھی خلاف ہے. چنانچہ علماء کرام نے اس جھوٹے نعرہ کی قلعی کھولنے کے لئے سیر حاصل تحریری اور تقریری کاوشیں کی ہیں. میرے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب "سیرت خاتم الانبیاء" میں اس جھوٹ کا پول مختصر اور جامع انداز میں کھول دیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اس پر ایک مستقل کتاب "دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" تالیف فرمائی بعد میں وہ کتاب "اشاعت اسلام" کے نام سے شائع ہونے لگی۔ جس میں تاریخی حقائق سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں بلکہ اپنی حقانیت اور فطری کشش سے پھیلا ہے۔

زیر نظر کتاب "دنیا کو اسلام سے کس کس طرح روکا گیا" بھی مستشرقین کے اسی نعرے کا دوسرے انداز میں جواب ہے. جس میں واقعات اور اسلامی تاریخ سے یہ واضح کیا

گیا ہے کہ معاملہ صرف یہ نہیں کہ لوگوں کو تلوار کے زور سے زبردستی مسلمان بنایا گیا ہو بلکہ اس کے برعکس تاریخی حقائق بتلاتے ہیں کہ اسلام دشمنوں نے لوگوں کو اسلام سے روکنے کے لئے ان پر ظلم و ستم کے کیسے کیسے حربے استعمال کئے. اس کے باوجود یہ اسلام کی حقانیت اور دل موہ لینے والی کشش ہی تھی کہ انہوں نے ہر ظلم و ستم برداشت کیا لیکن اسلام کی نعمت گراں مایہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیا. جانیں دیدیں اور سب کچھ قربان کر دیا لیکن دین اسلام کو ایک لمحے کے لئے چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔

یہ کتاب میرے والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ کے ایک عظیم المرتبت استاذ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب قدس اللہ سرہ کی تالیف ہے جو دارالعلوم دیوبند کے ان اکابر اساتذہ میں ممتاز مقام رکھتے ہیں جن کو دارالعلوم دیوبند میں بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے. پاکستان، بنگلہ دیش، بھارت اور برما میں اس وقت جو ہزاروں دینی مدارس دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہیں ان سے فارغ ہونے والا کوئی عالم دین اس وقت ایسا نہیں ہو گا جو شیخ الادب رحمتہ اللہ علیہ کا بالواسطہ یا بلاواسطہ شاگرد نہ ہو۔

میں نے اپنے بچپن سے بلوغ تک شیخ الادب رحمتہ اللہ علیہ کے واقعات اور ارشادات اپنے والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ سے اتنی کثرت سے سنے ہیں کہ ان کا اسم گرامی آتے ہی دل میں ان کی عظمت و محبت کے چراغ جلنے لگتے ہیں۔ حضرت والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ موصوف میرے بڑے محسن ہیں مجھے علم کی جو کچھ شد بد حاصل ہوئی اس کی بنیاد استاذ موصوف ہی نے رکھی۔

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمتہ اللہ علیہ فنائی العلم تھے صبح سے رات تک کوئی وقت علمی مشغلے سے خالی نہ تھا. طلباء کے ساتھ خود بھی محنت کرتے تھے اور انہیں بھی محنت کرنی پڑتی تھی ـــــ عربی ادب کی مشہور کتاب "مقامات حریری" کا درس جس مثالی انداز میں دیتے تھے اس کا شہرہ برصغیر میں پھیلا ہوا تھا. بہت سے فارغ التحصیل علماء بھی محض حضرت شیخ الادب سے یہ درس پڑھنے کے لئے دارالعلوم دیوبند میں آکر داخل ہوتے تھے. میرے والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ نے بھی یہ کتاب انہی سے پڑھی ہے. والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"میں مقامات کے تکرار (اعادہ درس) میں شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی پوری تقریر کا اعادہ اسی ترتیب سے کیا کرتا تھا جس طرح استاذ محترم نے بیان کی تھی۔ بعض اوقات استاذ محترم میری لاعلمی میں میرا تکرار سنتے اور مجھے بعد میں پتہ چلتا کہ وہ سن کر بہت خوش ہوئے ہیں"

تواضع، تقویٰ اور اتباع سنت میں بھی وہ سلف صالحین کا بہت حسین نمونہ تھے، دارالعلوم دیوبند میں طلباء میں یہ بات مشہور تھی کہ کوئی بھی شخص ان کو سلام کرنے میں پہل نہیں کر سکتا، کیونکہ انہوں نے سلام میں پہل کرنے کی ایسی مشق کی ہوئی تھی کہ دوسرے ابھی سلام کرنے کا سوچ ہی رہے ہوتے تھے کہ حضرت فوراً انہیں سلام کر لیتے تھے۔ یہ معلوم ہی ہے کہ سلام میں پہل کرنے کا ثواب جواب دینے سے زیادہ ہے۔ تواضع اور اتباع سنت کی یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے ورنہ ان کی پوری زندگی ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔

ایک واقعہ میرے بچپن میں میرے ساتھ پیش آیا جس کا گہرا نقش دل پر قائم ہے، تحریک قیام پاکستان کے سلسلے میں جب میرے والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوگئے تھے، اور شب و روز تحریک قیام پاکستان میں منہمک تھے ایک جمعہ کو بعد نماز جمعہ ہمارے گھر پر کچھ مقامی علماء والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے پاس کسی معاملے میں مشورے کے لئے جمع تھے دوران گفتگو طے ہوا کہ اس کے بارے میں سب شیخ الادب رحمتہ اللہ علیہ کے پاس چلتے ہیں تاکہ ان سے بھی مشورہ ہو جائے، والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے مجھے بھیجا کہ جاؤ دیکھ کر آؤ حضرت اپنے کمرے میں موجود ہیں یا نہیں، میں دارالعلوم کی مسجد سے ملحق کمرے کے پاس پہنچا تو وہ اندر سے بند تھا۔ مجھے چاہئے تھا کہ آس پاس کے کسی طالب علم یا استاذ سے معلوم کر لیتا کہ حضرت موجود ہیں یا نہیں، لیکن بچکانہ حماقت یہ کی کہ دروازے کو دستک دیدی، حضرت اسی وقت آرام کے لئے لیٹے تھے، باہر تشریف لائے کسی ناگواری کا اظہار کئے بغیر سلام و دعا کے بعد پوچھا کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے یہ دیکھنے کے لئے بھیجا ہے کہ آپ کمرے میں موجود ہیں یا نہیں، یہ

سن کر حضرت نے مجھے رخصت کر دیا، واپسی میں مجھے کچھ بچکانہ مشغلے راستے میں مل گئے۔ قدرے تاخیر سے گھر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ حضرت شیخ الادب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے گھر پر موجود تھے حالانکہ اس مجلس میں جتنے حضرات تھے وہ سب کے سب موصوف کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد تھے، لیکن یہ گوارا نہ فرمایا کہ یہ مشورے کے لئے ان کے پاس آئیں خود وہاں تشریف لے آئے۔ مولانا موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے حالات خاصی تفصیل سے ان کے شاگرد رشید حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کشمیری نے بھی "تذکرۃ الاعزاز" کے نام سے کتابی شکل میں تحریر فرمائے ہیں، تفصیل کے لئے اس کی مراجعت کی جاسکتی ہے۔

۱۹۸۹ء کے اواخر میں احقر کی حاضری دیوبند ہوئی تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند جناب مولانا حامد میاں صاحب نے زیر نظر کتاب کا مسودہ از راہ محبت عنایت فرمایا کہ اسے پاکستان میں شائع کر دیا جائے۔ اور الحمدللہ اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہوئے یہ کتاب ہدیہ قارئین کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قارئین کے لئے نافع اور مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے لئے ذخیرہ آخرت بنائے اور موصوف کے جلیل القدر صاحبزادے جو اس کی اشاعت کا ذریعہ بنے، اللہ تعالیٰ ان کو دنیا و آخرت میں اس کا اجر عظیم عطا فرمائے۔ واللہ المستعان

محمد رفیع عثمانی

خادم جامعہ دارالعلوم کراچی

۹ صفر المظفر ۱۴۱۲ھ

۲۱ اگست ۱۹۹۱ء

# بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

## (تمہید)

لک الحمد یارب العالمین والصلوٰۃ علی رسولک محمد و آلہ وصحبہ اجمعین۔

## میری تصانیف اردو نویسی اور بعض اہم حالات

محمود نامہ۔ مامقیمان۔ کریما۔ تو مجھ کو یاد ہے کہ میرے والد (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رحمۃ واسعۃً) نے مجھ کو پڑھایا تھا، اور وہ بھی اس طرح کہ سرکاری رجسٹر بغرض تکمیل گھر لے آتے تھے۔ وہ رات میں ان کی تکمیل کرتے جاتے تھے۔ اور میں ان کی چارپائی کے پاس پٹی کے نیچے کھڑا ہوا پڑھتا تھا۔ مگر یہ یاد نہیں کہ میں نے اردو کس سے پڑھی۔ غالباً محمود نامہ وغیرہ کے بعد میں نے اردو پڑھنا سیکھ لی تھی۔ آنکھ کھولی تو گھر میں جو کہ بہن بھائیوں سے بھرا ہوا گھر تھا بیت بازی کا شوق دیکھا۔ ایک بچہ ایک شعر پڑھتا تھا مقابل کے لئے ضروری تھا کہ اس کے جواب میں کوئی ایسا شعر پڑھے جس کا ابتدائی حرف وہ حرف ہو جو حریف کے شعر کا انتہائی حرف ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہوگیا اور شعر صحیح طور سے پڑھ دیا تو پھر اس پہلے بچے پر اسی کا جواب ضروری تھا۔

غلط پڑھنے پر حریف کی جانب سے "القط" کہہ دیا جاتا تھا جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس شعر کو جواب میں پیش کرنا ناقابل اعتبار ہے۔ پھر اس مجلس میں ایک مرتبہ پڑھا ہوا شعر خواہ مقبول ہوا ہو یا مردود دوبارہ نہ پڑھا جاسکتا تھا۔ اور بسا اوقات اس شرط کا بھی اضافہ ہوتا تھا کہ اگر شعر پڑھنے والے نے پڑھے ہوئے شعر کا مطلب نہ بتایا تو یہ شعر ساقط الاعتبار ہے۔

اس کا شوق کچھ ایسا تھا کہ گھر میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو کہ یہ امتحان مقابلہ منعقد نہ ہوتا ہو اور صرف گھر کے بچے نہیں بلکہ بسا اوقات اس مجلس مناشدت میں محلے کے بچے بھی آجاتے تھے. اور ہم میں سے ہر ایک کو کثیر التعداد اشعار یاد ہوگئے تھے اور برجستہ پڑھتے تھے۔

**مولود خوانی**: شاہجہاں پور میں مبتدعانہ دینداری کا رواج تھا. قابل ذکر بدعات میں مولود شریف کا چرچا زیادہ تھا حتیٰ کہ عورتوں کی مجلسوں میں بھی مولود خوانی ہوتی تھی۔

شاہجہاں پور کے پٹھانوں میں پڑھنا لکھنا زیادہ مرغوب چیز نہ تھی، شاہی زمانے میں جس طرح فوجی سپاہی تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتے ہونگے اسی طرح یہ لوگ بھی جانتے تھے. مکاتب. مساجد. سرکاری مدارس. اور اسکول کی زیادہ تر آبادی. دھنے. جولاہوں. قصابوں سے ہوتی تھی. ایسی صورت میں اس جماعت کی عورتوں میں پڑھنا لکھنا جس قدر ہو گا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

اس کمی کے باوجود بعض عورتوں میں مولود خوانی ضروری تھی اور اس کا اہتمام عورتوں میں زیادہ تھا. کسی باوقعت شخص کے مرنے کے بعد تیجے. دسویں. چالیسویں میں جس طرح مولود خوانی ضروری تھی اسی طرح شادی. ختنہ. عقیقہ میں بھی مولود خوانی ضروری تھی. ڈومنیوں کے ناچ گانے سے قبل یا بعد یہ مجلس ضروری تھی۔

میں اور میرے چھوٹے بھائی منشی حاجی محمد اقبال علی مرحوم بہت ہی چھوٹے بچے تھے. اردو دانی اور نظم خوانی کے نتیجے میں ہم دونوں اچھے مولود خوان تھے. مردانہ مولود کی بعض بڑی بڑی مجالس میں مولود کے اشعار ہم دونوں ملکر پڑھتے تھے. اور ہماری صغر سنی ہماری اغلاط کی پردہ پوشی کرتی تھی. بلکہ اکثر تعریفیں ہی ہوا کرتی تھیں. اور اسی صغر سنی کی وجہ سے زنانہ مولود میں ہمارا داخلہ بکثرت ہوگیا. اکثر محلوں میں ہم دونوں جاکر مولود پڑھتے تھے. اس مذہبی مگر جعلی فریضے کے ارکان و مستحبات ہم کو خوب مستحضر تھے. ناممکن تھا کہ ہم اس کا ایک مستحب بھی چھوڑ دیں۔

شادیوں کی مجلس میں چونکہ مولود خوان سے پہلے یا بعد ڈومنیوں کا گانا اور ناچ بھی ہوتا

تھا. اس لئے یہ بھی اتفاق ہوتا تھا کہ ہم دونوں بھائی مولود کی کتابیں بغل میں دبائے ہوئے ایسے وقت پہنچ جاتے تھے کہ راگ رلیوں کی یہ محفل اپنے شباب پر ہوتی تھی. ہم دونوں کو اس محفل کی منتظم عورتیں کسی جگہ بٹھا دیتی تھیں. اور اسی وجہ سے ناچ دیکھنے اور گانا سننے کا شرف بھی حاصل ہو جاتا تھا. فطری طور پر مجھ کو ناچ گانے سے دلچسپی نہ تھی. اس لئے اس ہڑبونگ کو میں بارہا دیکھا مگر اکثر بلا کر لے جانے والی عورت سے دریافت کرلیا کرتا تھا کہ ناچ ختم ہوچکا یا نہیں. بلکہ یہ بھی کہہ دیا کرتا تھا کہ ناچ ختم ہوچکے گا تب جائیں گے اور چونکہ ہم کو مولود خوانی کی کوئی اجرت نہ ملتی تھی اس لئے میرا یہ انچھر کامیاب بھی ہوتا تھا۔

**ناول بینی:** یہ تو یاد نہیں کہ مجھ کو ناول بینی کا مرض کس طرح شروع ہوا اور اس قسم کی کتابیں میرے پاس کس ذریعہ سے آتی تھیں. مگر یہ اچھی طرح یاد ہے کہ مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی اور مولوی محمد علی صاحب ہردوئی مشہور ناول نویس اصحاب کے عروج کا زمانہ تھا. اور انہیں کے ناول میں دیکھا کرتا تھا. یہ ناول بینی والد صاحب رحمہ اللہ یا بڑے بھائی صاحب کے خوف سے چھپ کر ہوتی تھی. اور بسااوقات چاند کی روشنی میں ہوتی تھی کہ سب سوتے تھے اور میری ساری ساری رات کی نیند ناول بینی کی نذر ہو جاتی تھی اور میرے ضعف بصر کا راز اسی ناول بینی میں مضمر ہے۔

## قصبہ تلہر شاہجہان پور کا قیام:

والد رحمہ اللہ شاہجہان پور کے سب رجسٹرار آفس میں محرر اول تھے. انکی تبدیلی شاہجہان پور کے ایک قصبہ تلہر نامی میں کر دی گئی. مکان جو سکونت کے لئے لیا گیا تھا اس میں کھنڈ سار (گنے کے رس سے شکر وغیرہ بنانے کی دیسی فیکٹری) تھی. خسارے کی وجہ سے یہ فیکٹری بند ہوگئی. موجودہ تعمیر کے علاوہ اس میں دو چھپر ڈلوائے گئے تھے یہ چھپر اس قدر نیچے تھے کہ ان میں داخل ہونے سے اگر ذرا سی بےاحتیاطی (سر اٹھاکر داخل ہونا) ہو جاتی تھی تو اس کی سزا فوراً ہی ملتی تھی اور سر میں سخت چوٹ لگتی تھی. بعض مرتبہ اس پر قہقہے لگتے تھے. بعض مرتبہ اس پر ہمدردی کا اظہار ہوتا تھا۔

میرے ایک ظریف الطبع بھائی نے ان چھپروں کے سامنے یہ شعر آویزاں کر دیا۔

گردن کشی ملاتی ہے انساں کو خاک میں لازم ہے آدمی کو ذرا سر جھکا چلے

میں مدرسہ "گلشن[1] فیض" سے گھر واپس ہوا تو جلی قلم کا لکھا ہوا یہ شعر، بھائی بہنوں کو ہنس ہنس کر پڑھتے ہوئے دیکھا کتابیں طاق پر رکھتے رکھتے دو شعر تصنیف کئے اور ان کو محررہ بالا شعر کے پاس کھڑے ہو کر مولود کے لہجے میں پڑھنا شروع کر دیا۔

جب سے ہم آئے ہیں تلہر۔ صل علی محمد + ٹوٹا سا اک ملا ہے گھر۔ صل علی محمد۔ جس میں پڑے ہیں دو چھپر۔ صل علی محمد + جس سے کہ ٹوٹتے ہیں سر۔ صل علی محمد

یہ شعر گھر بھر میں اسی لہجے میں پڑھے جانے لگے، والدہ ماجدہ رحمہ اللہ ایک دیندار باپ کی دیندار بیٹی تھیں، مجھ کو یاد ہے کے بچے کی زبان سے نکلے ہوئے شعروں کو سنکر مسکراتی بھی تھیں مگر اس خیال سے کہ یہ مولود شریف کی توہین ہے ساتھ ہی ساتھ "توبہ توبہ" بھی کہتی جاتی تھیں۔

**صحبت بد:** پڑوس میں ایک بزرگ صورت جناب مولوی نور الدین بدایونی رہا کرتے تھے، آپ تلہر کی عدالت دیوانی میں وکالت کیا کرتے تھے، والد رحمہ اللہ کا ان سے اچھا خاصہ تعارف تھا میں بھی گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، ان کو شعر گوئی کا شوق تھا، اور اساتذۂ کلام کے سینکڑوں اشعار یاد تھے، ان کی یہاں کی حاضری نے مجھ کو بھی شاعری کا شوق دلا دیا۔ میں اس زمانہ میں مدرسہ "گلشن فیض" میں پڑھتا تھا، اس مدرسہ کو چنگی سے غالباً دس روپیہ ماہوار کی امداد ملتی تھی، طلبہ سے فیس لی جاتی تھی، اور یہ سب کچھ مدرس اول (جناب مولوی مقصود علی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کا حصہ تھا۔

---

[1] یہ نام تاریخی ہے میزان سے کافیہ تک میں نے اسی مدرسہ میں پڑھا ہے، اس مدرسہ کے مدرس اول صاحب (رحمہ اللہ) کی توجہ سے مجھ کو صرف و نحو کے چند مسئلے یاد ہوگئے میں نے اس مدرسے سے جدا ہونے کے بعد (پینتالیس برس کے بعد) اس کو دیکھا تو وہاں بجز ناہموار زمین کے کچھ اور نہ پایا، یہ مدرسہ ظہیر محلہ جوئیاں میں جامع مسجد سے ملا ہوا تھا، وہاں پہنچ کر مجھ کو معلوم ہوا کہ عرب کے بدو دیار حبیب کے کھنڈروں پر کس طرح روتے تھے اور کیوں روتے تھے۔ ۱۲ منہ

شاعری: شاعری کا یہ شوق ابھی ابتدائی منزل میں تھا کہ مدرسہ مذکورہ کے بعض قواعد کی وجہ سے والدہ مرحومہ نے مجھ کو اور میرے چھوٹے بھائی کو اس مدرسہ سے جدا کر دیا، اور تلہر ہی کے ایک صاحب خلیل الدین نامی سے پڑھنے کا امر کیا۔ یہ صاحب اپنے متعلق عالم ہونے کے جہل مرکب میں مبتلا تھے، آپ کی عربی تعلیم زیادہ سے زیادہ ہدایۃ النحو تک تھی، مگر قصبہ کے عوام میں مولوی مشہور تھے، اس علمی بے بضاعتی نے ان کو آخری عمر میں مرتد (قادیانی) بنا دیا تھا۔ مگر شاعر برے نہ تھے جلالؔ لکھنوی مرحوم کے تلانذہ میں سے تھے۔

صرف و نحو کی کتابیں اگرچہ ابتدائی تھیں، میری عمر بھی زیادہ نہ تھی، لیکن تھا جناب مولوی مقصود علی خان صاحب" کا شاگرد، مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو نہ پڑھنا آتا ہے نہ پڑھانا مگر میرا شاگرد مجھ سے پڑھنے کے بعد کسی دوسرے سے پڑھنے کے قابل نہیں رہتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ مرحوم کے تلانذہ مرحوم سے جدا ہو کر یا تو تعلیم ہی ترک کر دیتے تھے اور یا مشکل سے کسی کو نظر میں لاتے تھے۔ میں نے دو ایک ہی سبق میں خلیل الدین احمد صاحب کی ناکارگی کا اندازہ کر لیا، مگر یہ عادت نہ تھی کہ اساتذہ کی توہین کروں، دوسری جانب مدرسہ گلشن فیض (تلہر) کے بچوں سے شرم بھی آتی تھی کیونکہ وہاں سے نام خارج کرا کر آیا تھا اس لئے حاضری برابر دیتا رہا۔

موصوف نے عربی کے اسباق تو "برائے بیت" کر دیئے مگر شاعری کے عمیق گڈھے میں ضرور گرا دیا، علامہ شوق نیموی اس زمانہ میں جلال اور ان کے تلانذہ پر بری طرح برس رہے تھے ان کے شائع شدہ مضامین دکھا کر اعتراضات کرتے تھے، صرف کے اوزان کچھ آتے ہی تھے اس لئے "عروض" میں مصروف کر دیا۔

مختصر یہ کہ ان کی خدمت میں رہ کر عربی کے اعتبار سے تو عمر ہی ضائع کی، مگر شاعری کا شوق بڑھ گیا، اور نوبت بایں جا رسید کہ قصبے کے بے فکر لوگ مشاعرے کے لئے مصرہائے طرح کا اعلان کرتے تھے اور اساتذہ اپنے اپنے "غادیون" کی جماعت کو لیکر زیب محفل ہوتے تھے، غزلخوانی ہوتی تھی، چونکہ عربی اسباق تو برائے نام ہی تھے، گھر میں کوئی عربی

پڑھنے والا تھا نہیں کہ دیکھ بھال کرتا. وقت زیادہ ملتا تھا میں نے غزلوں کی تصنیف شروع کی. اور مشاعروں میں ان کو پڑھنا شروع کیا. اور کم عمر ہونے کی وجہ سے اغلاط کی پردہ پوشی ہوتی تھی. اور کسی اچھے شعر کی زائد از حد مدح ہوتی تھی ناول بنی اور شاعری کے باوجود میں عشق، وصل، ہجر کے حقیقی مفہوم سے ناواقف تھا. مگر میدان مشاعرے کی مسابقت میں فارسی کی پڑھی ہوئی کتابیں یوسف زلیخا وغیرہ نے امداد کی، اور میں اچھی خاصی شعر گوئی کرنے لگا. اس زمانہ میں غزلوں اور اشعار کے لئے گلدستوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع تھا. میرے اشعار بھی شائع ہوتے تھے۔ افسوس ہے کہ اس وقت اتنا سلیقہ نہ تھا کہ ان اشعار کو جمع کر لیتا. ہاں چند اشعار جو یاد رہ گئے ہیں، یہ ہیں۔

(۱)

آیا نہیں کرتے ہیں کہ جایا نہیں کرتے　　ہاں پہلوئے عاشق میں وہ ٹھہرا نہیں کرتے
پہنچا جو میں بولے کہ لو پھر آگیا ظالم　　دربان اسے کس لئے روکا نہیں کرتے
دل[1] چھین لیا، جان کا بھی اب سے ارادہ　　بیکس کو تو یوں چور بھی لوٹا نہیں کرتے

(۲)

کچھ ہوش ہے اے ساقیٔ فرزانہ کسی کا　　لبریز ہوا جاتا ہے پیمانہ کسی کا
ہم آپ سے جاتے رہے سنتے ہوئے جس کو　　افسوں تھا الٰہی کہ وہ افسانہ کسی کا
اعزاز ترا حال سنا دے کوئی اس کو　　ہم دیکھتے ہیں حوصلہ ایسا نہ کسی کا

(۳)

دل ہی نہیں وہ دل کہ تری جس میں جا نہیں　　سر ہی نہیں وہ جس میں کہ سودا ترا نہیں
اے غیرت مسیح! تو اپنے مریض کو　　جا دیکھ تو، کہ اس میں کچھ اب ہے بھی یا نہیں
حسن بیان میں نہیں اعزاز کا نظیر　　"آصف[2] سا ملک میں کوئی فرمانروا نہیں"

---

[1] یہ شعر من اولہ الیٰ آخرہ میرا ہے، استاد نے اس میں اصلاح بالکل نہیں کی. مگر مجھ کو یاد ہے کہ اس کے پڑھنے پر "واہ واہ" کی آواز سے محفل مشاعرہ گونج اٹھی تھی۔

[2] یہ مصرعہ طرح ہے۔

(۴)

اے چرخ یہ نیرنگ نمائی تری کب تک بوڑھا کوئی بسمے سے جواں ہو نہیں سکتا
تیری نشیلی آنکھ نے بے خود بنا دیا اعزاز ورنہ صاحب عقل و شعور تھا

**مجلس مشاعرہ سے نفرت**: ایک مشاعرے میں یہ غزل پڑھی جس کا مقطع یہ آخری شعر تھا، "واہ واہ" کی آوازوں کے ساتھ حاضرین مشاعرے میں سے ایک معمر سفید ریش صاحب نے برجستہ باواز بلند کہا کہ "طفلے کہ دم ز عشق زند بس غنیمت ست" تحسین کا غلغلہ ابھی کانوں میں تھا کہ اس ترمیم شدہ مصرعہ نے آپریشن کا کام کیا اور مجھ کو تنبہ ہوا کہ میں غلط راستے پر جا رہا ہوں۔

حسن اتفاق سے شرکت مشاعرے کی خبر میرے بڑے بھائی جناب مولوی محمد وہاج علی صاحب (مرحوم) کو ہو گئی، وہ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ اگر آئندہ معلوم ہوا کہ تو مشاعرے میں شریک ہوا تو تیری عربی کی تمام کتابیں جلا دونگا، میں بھائی صاحب سے بہت ڈرتا تھا، اور عربی میں نے خود اپنے شوق سے شروع کی تھی اس لئے یہ زجر اثر کر گیا طبیعت تو اس سے پہلے ہی سے متنفر تھی، اس زجر کے بعد شعر گوئی اور مشاعروں کی شرکت دونوں متروک، بظاہر اب ضیاع وقت من جانب اللہ ختم کر دیا گیا تھا اس لئے میں اپنے محبوب مدرسہ "گلشن فیض" میں پھر پہنچ گیا، اس مدرسہ میں تعلیمی کام اس قدر تھا کہ بچوں کو ایام تعطیل میں بھی فضولیات کی مہلت نہ تھی۔

**شاہجہان پور کی واپسی**: والد رحمہ اللہ کی پنشن ہو چکی تھی، وہ تو بریلی سے جو کہ ہماری نانہال تھی کبھی بھی خوش نہ رہے، مگر خدا ہی جانے کہ کیوں؟ والدہ ماجدہ رحمہا اللہ بھی بغرض سکونت بریلی جانے پر راضی نہ تھیں اسی وجہ سے پنشن ہو جانے کے باوجود عرصہ تک ہم سب تلہر ہی میں رہے، اس اثنا میں جناب بھائی مولوی محمد وہاج صاحب شاہجہان پور کے محکمہ رجسٹری میں ملازم ہو گئے تو ہم سب پھر شاہجہان پور آ گئے، مقدرات الٰہیہ میں کچھ عمر کی تضییع اور مقدر تھی، چنانچہ تھوڑا وقت ضائع کر کے میں مدرسہ عین العلم (شاہجہان پور)

میں داخل ہوگیا۔ اور حضرۃ الاستاذ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مدظلہ سے کہ وہ اس وقت اس مدرسہ میں مدرس دوم تھے، سکندر نامہ شروع کیا، اور آہستہ آہستہ عربی کے اسباق میں بھی شریک ہوگیا۔

شرکائے اسباق میں ایک صاحب مولوی سید نور احمد صاحب بھی تھے، جو نہ صرف خود شاعر تھے بلکہ ان کے گھر کا بچہ بچہ شاعر تھا، ان کے ساتھ رہ کر شاعری کے شوق کی دبی ہوئی آگ پھر سلگنے لگی، مگر الحمد اللہ کہ یہ شوق صرف شعر سننے اور دوسروں کے اشعار پڑھنے تک محدود رہا۔

ہاں ایک وقت یہ بھی آیا کہ گرمی کے زمانہ میں مدرسہ کا وقت دو بجے سے پانچ بجے تک کر دیا گیا، میں نے کسی کے مشورے اور تحریک کے بغیر ایک مرثیہ لکھا جس کا صرف ایک شعر یاد ہے۔

دو بجے کا وقت ہے اور سب پڑے سوتے ہیں     اور مجبوراً پڑا ہم کو نکلنا ہائے ہائے

چھوٹی تقطیع کے چھوٹے اور سفید اوراق پر یہ مرثیہ لکھا ہوا میری کتاب میں تھا، دوستوں میں سے کسی کو سنایا بھی نہ تھا کہ اتفاق سے بوقت درس میری یہی کتاب حضرت مولانا سید بشیر احمد صاحب مراد آبادی مدرس اول مدرسہ مذکورہ (رحمہ اللہ علیہ) نے لے لی اور سبق پڑھانے کے ارادے سے کتاب کھولی تو اس میں یہ اوراق سامنے آگئے، ممدوح نے خوب ہنس ہنس کر اس کو پڑھا، جماعت نے سنا، حضرت الاستاذ مفتی محمد کفایت اللہ کے پاس بھیجا جو کہ اس وقت دوسری درسگاہ میں مشغول تدریس تھے، اور غالباً یہ اشعار حضرۃ الاستاذ مولانا عبید الحق خان صاحب قدس سرہ نے بھی سنے جو کہ اس وقت مدرسہ کے بااختیار بلا تنخواہ مہتمم تھے، اس مرثیہ میں کسی کی ہجو نہ تھی بلکہ سادگی کے انداز میں اپنی تکالیف کا اظہار تھا، اس لئے اس مرثیہ نے صرف قہقہوں کا خراج حاصل کیا، میرا اخراج نہ ہوا۔

**دیو بند کی پہلی حاضری:** حضرت الاستاذ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی اور حضرۃ الاستاذ مولانا عبید الحق خاں قدس سرہ مہتمم مدرسہ عین العلم کو قادر مطلق اپنے بے غایت انعامات سے سرفراز کرے کہ ان کی توجہ سے میں دیو بند پہنچ گیا۔

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد     دست بر پائے کبوتر زود ناگاہ رسید.

دیو بند سے واپسی: کچھ عرصہ کے بعد ہمشیرہ سے ملنے کے لئے میرٹھ گیا تو حضرت مولانا الحاج المولوی محمد عاشق الٰہی صاحب نے مجھ کو میرٹھ میں روک لیا اور میں مدرسہ قومی خیر نگر میں پڑھنے لگا۔

اپنے اسباق میں مشغول رہنے کے ساتھ مولانا ممدوح کے "مطبع خیر المطابع" و کتب خانہ کی خدمت بھی انجام دیا کرتا تھا، گویا میں مطبع اور کتب خانہ کا ایک بلا تنخواہ مگر بااختیار منیجر تھا، حمائل معری و مترجم کی تصحیح اور طباعت میرے اہتمام سے ہوئی، قرآن شریف مترجم طبع نہ ہوسکا۔ ممدوح نے اپنی مترجم حمائل شریف کے دیباچہ میں اس کا ذکر بہت شاندار اور شاکرانہ الفاظ میں کیا ہے، اور اسی لئے اس حمائل کو میں نے حرز جان بنا رکھا ہے۔

## جلسہ دستار بندی میں تقریر

شعبان میں جناب مولانا سید محمد علی صاحب نامی اور جناب مولانا حکیم سید محمد نقی حسین صاحب کی دستار بندی ہونی تھی، اول الذکر میسور کالج میں چوٹی کے پروفیسروں میں ہیں، غالباً آج کل ریٹائر ہوچکے ہونگے اور ثانی الذکر میرٹھ کے ممتاز اطبا میں سے ہیں۔

حضرۃ الاستاذ مولانا الحاج المولوی عبدالمومن صاحب نے حکم دیا کہ جلسے میں پڑھنے کے لئے اعزاز علی بھی ایک مضمون لکھے۔ میں نے فضلیت علم پر مضمون لکھا اس میں نثر کا حصہ میرا تھا، اور اشعار حضرت مولانا الحاج المولوی محمد عاشق الٰہی صاحب کے تھے، چونکہ ممدوح کا تمام کتب خانہ میرے ہی ہاتھ میں تھا، اسلئے ان کی ایک بیاض سے بھی میں واقف تھا، اس میں ان کے اپنے تصنیف کردہ اشعار تھے، عربی کے دو اشعار مصنفہ حضرت ممدوح مولانا عبدالمومن صاحب کی مدح میں تھے، حضرۃ مولانا الحاج المولوی محمد عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ نے یہ مضمون دیکھ کر فرمایا کہ تم نے میری بیاض میں سے سب کچھ لے لیا۔

یہ جلسہ خان بہادر نواب اسد اللہ خان کی سرکردگی میں تھا اور نواب صاحب ہی مدرسہ قومی کے مہتمم تھے، ان کی شرکت کی وجہ سے رؤسائے شہر بھی شریک تھے، بڑی بات یہ تھی کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ بھی تشریف فرما تھے، اولاً زبانی تقریر جناب مولانا سید محمد علی صاحب

نے کی جن کی دستار بندی ہونی تھی. اس کے بعد حضرۃ الاستاذ کے اشارے سے میں کھڑا ہوا. اور اس بےباکی سے اپنی نثر و نظم کو ختم کیا کہ آج بھی مجھ کو حیرت ہو جاتی ہے. مضمون ختم کر کے بیٹھا تو نواب صاحب نے حضرۃ الاستاذ مولانا عبدالمومن صاحب سے دریافت فرمایا کہ یہ لڑکا کون ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ آپ ہی کی برادری کا ہے اور آپ کے کارندے کے بیٹے کا سالا ہے. مجھ کو یاد ہے کہ نواب صاحب نے اس کے بعد پھر بھی بنظر غائر مجھ کو دیکھا۔

جلسے سے فراغت ہوئی تو حضرت شیخ الہند قدس سرہ مولانا الحاج المولوی محمد عاشق الہٰی صاحب کے مکان پر تشریف لائے جلسے کا ذکر آیا تو فرمایا کہ مولوی اعزاز علی کا مضمون بہت اچھا رہا (وکفی بہ فخرا) یہ تو یاد نہیں کہ حضرت قدس سرہ کے ان الفاظ نے میرے چہرے پر کیا اثر کیا مگر قلب کا یہ عالم اب تک یاد ہے کہ میں اپنے آپ کو آسمان پر سمجھتا تھا. مولانا نے جواب میں فرمایا کہ اعزاز علی کے مضمون نے تو حاضرین جلسہ میں سے کئی مشہور مضمون نویسوں کو مضمون پڑھنے سے روک دیا ورنہ فلاں فلاں اصحاب بھی نثر اور نظم لیکر آئے تھے. اس خیال سے نہ پڑھ سکے کہ اگر مضمون یا نظم پر داد ملی تو ایک لڑکے سے مساوات ہوگئی اور اگر کسی نے تعریف نہ کی تو بڑی ذلت ہوگی۔

**دیو بند کی مراجعت**: تین سال تک میرٹھ میں رہ کر پھر دیو بند آگیا. کتابوں سے فارغ ہوا ہی تھا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے ایما سے پورینی ضلع بھاگل پور کے مدرسہ نعمانیہ میں صدارت تدریس کے خدمت انجام دینے کے لئے حاضر ہوا۔

**مدرسہ نعمانیہ میں قیام**: مدرسہ کے کارکنوں میں ایک صاحب جناب مولوی حکیم عبدالغفور صاحب تھے جو مدرسے کے نائب مہتمم تھے. اہتمام کی خدمت وہی انجام دیتے تھے. مہتمم صاحب تو عملاً اعزازی مہتمم ہی تھے. نائب مہتمم صاحب لکھنؤ میں طب کی تکمیل کر چکے تھے۔ اخبار بینی کا آپ کو شوق تھا بعض اخبار قیمتہً منگوایا کرتے تھے. اور بعض مضمون نگاری کے صلے میں مفت آیا کرتے تھے آپ کے مضامین عموماً اودھ پنچ اخبار لکھنؤ کے ڈیزائن پر ہوتے تھے۔

**میری مضمون نگاری:۔** دیوانہ "ہوئے بس ست" آپ کے ساتھ میں نے بھی مضمون نگاری شروع کر دی. اور نہ صرف مضمون نگاری بلکہ شاعری بھی شروع کر دی. اس شاعری میں حسن و عشق کے کرشمے نہ ہوتے تھے بلکہ ادبی اور اخلاقی مضامین ہوتے تھے. مدرسہ نعمانیہ کے بچوں کے نام سے مختلف اخباروں میں مضامین شائع کرتا تھا. اخبار "وفادار لاہور" میرے ان مضامین کا بہت زیادہ مداح رہا کرتا تھا۔

**ہڑبونگ:۔** مدرسہ نعمانیہ پورینی کا ایک جلسہ بمقام بھاگل پور ہوا. پورینی کی قادیانی جماعت کے انگریزی تعلیم یافتوں میں سے کسی نے اس کے جلسے کی روئداد کو نہایت ہی برے انداز میں بزبان انگریزی شائع کرایا۔ جناب مولوی فقیر حسن صاحب. سررشتہ دار ججی و نائب صدر "انجمن غربا پورینی" نے اس کا ترجمہ مجھ کو دیا. میں نے ایک طویل مگر اردو مضمون میں اس کا سخت جواب دیا۔ یہ جواب کئی اخباروں میں قسط وار شائع ہوا. رفیق ہند مراد آباد نے اس کو چند قسطوں میں شائع کیا. یہ مضمون اگرچہ گمنام تھا مگر مخالفین کو معلوم ہو گیا کہ اعزاز علی اس میں شریک ہے. اس لئے درپے آزار ہوگئے. خدا کا شکر ہے کہ نہ میں کبھی خائف ہوا نہ مجھ کو کوئی تکلیف پہنچا سکا۔ میری یہ مضامین نگاری اسی پر ختم نہ ہوئی بلکہ مدرسہ نعمانیہ میں یا پورینی کے کسی خاندان میں کوئی چیز قابل اصلاح ہوتی تھی اور اس کو صفائی کے ساتھ سامنے آکر نہ روکا جاسکتا تھا. تو اس کے متعلق کسی مجہول شخص کے نام سے اخبار میں لکھ دیتا تھا. اور عموماً اس کا اثر اچھا ہوتا تھا. مگر غالباً آج تک بھی علام الغیوب کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں کہ ان مضامین کا کاتب کون تھا۔

**مدرسہ نعمانیہ کی تعمیر:۔** مذکورہ مدرسہ کی تعمیر ہوئی. یہ ایک خام عمارت تھی. پھوس کے چھپر اس پر ڈالے گئے تھے. اس کے اختتام کی خوشی میں ایک مختصر سا جلسہ ہوا. بھاگل پور سے بھی کچھ لوگ بغرض شرکت آئے. مدرسہ کے بچوں نے میرے لکھے ہوئے مضامین اپنے اپنے نام سے پڑھے. آخر میں میں نے ایک نظم پڑھی جو ساٹھ یا ستر شعر پر مشتمل تھی اور جس کا مطلع یہ تھا۔

یا خدا اہل پورینی پہ ہے تیری رحمت　　ایسی گمنام سی بستی کو عطا کی شہرت

حضرت الاستاذ مولانا الحاج المولوی محمد سہول صاحب فطری طور پر رقیق القلب تھے. انہوں نے رونا شروع کر دیا، پس پھر کیا تھا. جلسے کے اکثر شرکاء نے اس کار خیر میں شرکت کی خود میں بھی رویا، یہ اشعار طبع تو نہ ہوئے مگر اس کی نقول بھاگل پور کے متعدد اصحاب کے پاس اب تک ہوں گی۔

**مدرسہ مذکورہ کا آخری اجلاس:۔** جناب مولوی فقیر حسن نائب صدر انجمن کی وفات ہوگئی. جناب مولوی سید ابو البقا محمد صاحب رئیس پورینی کا انتخاب مرحوم کی جگہ ہوا. مدرسہ مذکورہ کا پانچواں سالانہ اجلاس ہوا. میں نے اس میں ایک طویل مسدس پڑھا. جو بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ اور اس کے مختلف ٹکڑے بار بار اخبارات و رسائل میں شائع بھی ہوئے۔ اس کے بعد صرف ایک سالانہ اجلاس اور ہوا. جس میں حسن اتفاق یا سوء تدبیر سے علماء دیو بند میں سے حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ. حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی قدس سرہ. حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مبتدعین میں سے مولانا محمد فاخرالہ آبادی. مولوی احمد اشرف صاحب کچھوچھوی کا اجتماع ہوگیا. مؤخر الذکر فریق نے جلسہ ہی سے فتنہ اور اکابر دیوبند پر فتویٰ تکفیر کی ابتدا کر دی. اور یہ فتنہ بڑھتے بڑھتے بہت زیادہ ہوگیا. مگر میں اس وقت بھاگل پور سے شاہجہانپور آگیا تھا۔

**حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی شفقت:۔** علی گڑھ کالج کے ایک ظریف اور ذکی طالب علم نے اپنے معاصرین کے ایک مخصوص جلسے میں ظریفانہ انداز میں کہا کہ مجھ کو تم سب پر فوقیت حاصل ہے لوگ سمجھ گئے کہ اس وقت کوئی دل خوش کن بات معلوم ہوگی. اس لئے کئی آوازیں آئیں کہ غلط ہے. فرمایا کہ دیکھو. کوئی ہندو یا مسلمان انگریزی کا طالب علم ایسا بتاسکتے ہو جو لندن گیا اور امتحان میں کامیاب ہو کر نہ آیا ہو. حاضرین نے کہا کہ ایسا کوئی نہیں ہے. فرمایا کہ یہ طغرائے امتیاز مجھ کو اور صرف مجھ کو حاصل ہے کہ میں لندن گیا. وہاں سالہا سال رہا اور امتحان میں ناکام ہی رہا. اس پر ایک قہقہہ لگا۔ حضرت شیخ الہند کے تلامذہ فلک علم

کے شمس اور بدر ہیں. مگر یہ فضیلت تامہ مجھ کو اور صرف مجھ کو ہی حاصل ہے کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے کثرت مشاغل ضروریہ اور ضعف قویٰ کے باوجود میرے اس نصف مسدس میں اصلاح کی. اور مجھ کو یقین ہے کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کو بجز میرے کسی کے اردو اشعار میں اصلاح کرنے کی نوبت نہیں آئی. (ع) بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس ست۔ میں نے مذکورہ بالا مسدس حضرت ممدوح قدس سرہ کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کیا. یہ مسدس سَو سے زیادہ اشعار پر مشتمل تھا. ان اشعار میں میں نے امت اسلامیہ کا مدوجزر بتاکر مدرسہ دیوبند کی بِنا کا اور اس کے بانی قطب العالم قاسم الخیرات نور اللہ مرقدہ کا ذکر کیا. اور یہیں تک حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے اصلاح فرمائی. بعد والے اشعار میں مدرسہ نعمانیہ پورینی کے کارکنوں کی مدح. مدرسہ کے کارنامے. عام چندے کی اپیل تھی. ان اشعار میں آپ نے کوئی ترمیم نہیں فرمائی۔

مسدس:۔ مسدس مذکور کا ابتدائی اور اصلاح شدہ حصہ یہ ہے. اجلاس سالانہ مدرسہ نعمانیہ پورینی ضلع بھاگل پور ۱۳۲۶ھ

مژدہ باد ای حامیانِ قوم، و ہمدردانِ دیں  مژدہ باد. ای خادمانِ شرع و قرآنِ مبین
مژدہ باد. ای نائبانِ رحمتہ للعالمین  مژدہ باد. ای وراثانِ عِلم ختم المرسلین

دردمندانِ یتامیٰ! لو، مبارک باد ہو
سرپرستانِ ایامیٰ! لو، مبارک باد ہو

ہے غریبانِ پورینی کی جو یہ اک انجمن  جس کی غربت ہو گئی مقبول ربِّ ذوالمِنَن
فیض سے جس کے تروتازہ ہوا دینی چمن  جس سے یاں پھیلے اصول و فقہ و تفسیر و سنن

پانچواں سالانہ جلسہ آج اس کا دیکھئے
فیض نے اس کے کھلائے گل ہیں کیا کیا دیکھئے

اک طرف تشریف فرما، اہلِ علم و اتقیا　　اک طرف رونق فزا، خاصانِ حق اور اصفیا
اک طرف جلوہ فروز اسلام کے اہلِ سخا　　اک طرف ہے عاشقانِ دین کا مجمع بھرا

یہ وہ مجمع ہے کہ ہے مصداق حزب اللہ کا
آنکھ پڑتے ہی زباں سے نکلے ہے صلِّ علیٰ

تھی جہالت کی گھٹا چاروں طرف چھائی ہوئی　　چھوڑ بیٹھے تھے مسلماں راہ بتلائی ہوئی
کھو چکے تھے دولتِ اسلام ہاتھ آئی ہوئی　　بگڑی وہ حالت کہ اک خلقت تماشائی ہوئی

بَن کے ایسے بگڑے، غیروں کو بھی رونا آگیا
خندۂ غفلت سے مہلت ان کو ہو یہ ذکر کیا

ان کے اعمال اور کچھ تھے، اور تھے اقوال کچھ　　حالتِ دل اور کچھ تھی، اور قیل و قال کچھ
سمجھے تھے جہل و فلاکت ہی کو اپنا مال کچھ　　تھے زباں پر صرف پہلوں کے قصص امثال کچھ

تھی ترقی روز و شب ان کو مگر معکوس تھی
ان کی صحت سے طبیعت ہوچکی مایوس تھی

کثرتِ جہل و ہوس سے ہوچکے تھے پائمال　　کیا عجب تھا گر اترتا قہرِ رب ذوالجلال
ذلت و خواری کو سمجھے تھے یہ دولت لازوال　　منہمک دنیا میں تھے، عقبیٰ کا تھا کس کو خیال

خسف کے شایاں تھے قابل مسخ ہوجانے کے تھے
صفحۂ ہستی سے لائق نسخ ہوجانے کے تھے

یہ تو سب کچھ تھا مگر آخر یہ امت کس کی تھی    خِلقتِ آدم سے پہلے ہو چکے تھے جو نبی
اُمتِ مرحومہ کا پیارا لقب تھی پاچکی.    پھر بھلا ذلت میں کٹتی کیونکر اس کی زندگی

باعثِ ایجادِ عالم سے ہے اس کو انتساب
مَہبطِ الطافِ یزداں جن کی ہے عالی جناب

اُمتِ فخرِ دو عالم کی جو یہ حالت ہوئی    غیرتِ حق سے نہ ذلت ان کی یہ دیکھی گئی
دیکھ کر خیرالامم کی بے زری و بے پری    آفتابِ رحمتِ حق نے کی ذرّہ پروری

وہ کئے اسباب پیدا اک اچنبھا ہوگیا
ایک رحمت کی نظر میں کیا تھا اور کیا ہوگیا

کثرتِ عصیاں تھی یا تھی کثرتِ فسق و فجور    سب کا باعث ایک تھا. تھے علمِ حقانی سے دور
اس مرض کے دور کرنے کے لئے یہ تھا ضرور    شمعِ علمِ دیں ہو روشن. اور پھیلے اس کا نور

مادّہ کا تنقیہ جب تک نہ ہو کیا فائدہ
چند روزہ گر شفا بھی ہو تو کیسا فائدہ

احمدِ مُرسَل ہوئے فخرِ دو عالَم. علم سے    اَلفُ عابد ایک عالم سے ہیں کیوں کم. علم سے
خاک میں واللہ ہے شیطان کا دم، علم سے    سلسلہ شرع و ہدایت کا ہے پیہم. علم سے

جب ملائک کو خلافت میں ہوا کچھ ارتیاب
دیکھ فضلِ علمِ آدم رہ گئے سب لاجواب

علم ہی سے خضر کو موسیٰ کی استاذی ملی ‏ ‏ جستجو موسیٰ کو عرصے تک اسی کی ہی رہی
عَلِّمْنِیْ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَم ہے شانِ احمدی ‏ ‏ حکمِ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا کے مخاطب ہیں نبی

شمعِ عرفاں علم ہے. شمسِ ہدایت علم ہے
اصلِ ایماں علم ہے. رکنِ رسالت علم ہے

آفتابِ علمِ دیں چمکا ہدایت کے لئے ‏ ‏ ابرِ رحمت چھا گیا علمی اشاعت کے لئے
علم نے ٹھہرایا اک موقع اقامت کے لئے ‏ ‏ تھے جہاں ابرارِ امت دینی خدمت کے لئے

سب نے مل کر مدرسہ اخلاص سے قائم کیا
مصدرِ فیضِ نبی دیوبند سا قصبہ ہوا

مخزنِ علمِ نبی، آنکھوں کا تارا، دیوبند ‏ ‏ معدنِ فضل وہُدیٰ، ہم سب کا پیارا، دیوبند
پنجۂ شیطان سے چھٹنے کا سہارا، دیوبند ‏ ‏ دیوبندی ہم ہیں "حسن" اور ہے ہمارا دیوبند

ہونے بھی دو گر کسی کو این و آں پر ناز ہے
نسبتِ دیوبند یاں تو مایۂ اعزاز ہے

تھا رئیس الطائفہ ان سب کا اک قطبِ زمن ‏ ‏ ہادیِ راہِ یقین، کشّافِ قرآن و سُنن
قاسم بزم ہدایت، مقتدائے اہل فن ‏ ‏ فیض سے جس کے تر و تازہ ہے مصطفوی چمن

ولولہ ہے دل میں لیجئے نامِ نامی آپ کا
قاسم الخیرات ہے اسمِ گرامی آپ کا

مظہرِ اسماء و افعالِ جنابِ کبریا　　مظہرِ اخلاق و اوضاعِ محمد مصطفٰی
تاجدارِ ملکِ فقر و صدرِ بزمِ اولیا　　رازدارِ دینِ حق، سرچشمۂ علم و ہُدٰی

کیا فقط دیوبند ہی محسود اور ممتاز ہے
سر زمینِ ہند کو اس رہنما پر ناز ہے

آفتابِ علم جب دیوبند سے روشن ہوا　　عکس اس کا شرق سے مغرب تلک پڑنے لگا
بچے سے بوڑھے تلک ہراک کو فیض اس کا ملا　　اپنی اپنی قابلیت کا ہی بس اک فرق تھا

فیض سے اس کے منور ہیں زمین و آسمان
ہے حدیثِ سَروَرِ کونین کی تکرار واں

**افضل المدارس شاہجہانپور میں:** ۔ والد رحمہ اللہ زائد از حد ضعیف ہوچکے تھے، ان کو توقع تھی کہ اگر میں شاہجہان پور میں قیام کرلوں گا تو ان کو فی الجملہ آرام پہنچے گا۔ اس لئے ان کے ارشاد کے موافق میں نے مدرسہ نعمانیہ پورینی کی ملازمت ترک کی اور مدرسہ افضل المدارس شاہ جہاں پور کی خدمت منظور کرلی۔

اس مدرسہ کی سرپرستی جناب مولوی ریاست علی خاں شاہ جہان پوری مرحوم کے متعلق تھی، یہ صاحب جناب مولوی ارشاد حسین صاحب رامپوری کے شاگرد تھے، ان کے مزاج مبارک میں غلّو اس قدر تھا کہ اپنے زمانہ کے کسی عالم کو طفل مکتب سے زیادہ درجہ نہ دیتے تھے، اگر "اذکروا محاسن موتاکم" پیش نظر نہ ہوتا تو ان کے اقوال وافعال ضرور بیان کرتا، کیونکہ بہت زیادہ دلچسپ تھے۔

مدرسہ مذکورہ میں میری تدریس ہوتے ہی موصوف نے جناب حاجی فضل احمد خاں صاحب کو بلوایا (حاجی صاحب مرحوم اس مدرسہ کے تمام اخراجات کے کفیل تھے) اور کہا کہ اگر تم اپنا روپیہ حرام کاری، شراب خوری، اور قمار بازی، میں صرف کرتے تو ظاہر ہے کہ بہت بڑے

گنہگار ہوتے. مگر اس قدر گناہ نہ ہوتا جس قدر کہ اس دیوبندی کو مدرس بنانے سے ہورہا ہے. اور یہ گناہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک کہ اس کا پڑھایا ہوا ایک فرد بھی زمیں پر باقی رہے گا۔

حاجی صاحب مرحوم بھی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھے ان پر اس کا اثر کچھ نہ ہوا. ہنس کر چپ ہورہے۔ بعض بعض مسائل میں ان سے تحریر بازی ہوئی مگر کسی طویل تحریر کا موقع نہ آیا۔

**میرے حواشی:۔** افضل المدارس کے اس قیام میں میں نے ارادہ کیا کہ کنزالدقائق کا مختصر تحشیہ کروں، جو کہ جامع اور مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ مفید بھی زیادہ ہو. اس حاشیہ کے دو چار ورق بھی نہ ہونے پائے تھے کہ حاجی فضل احمد خاں صاحب علیل ہوئے بغرض علاج مراد آباد تشریف لے گئے. اور وہیں انتقال ہوا. میں نے اس مدرسہ میں ایک ماہ تک کام کیا. اس کے بعد بتحریک حضرت الاستاذ مولانا الحاج المولوی محمد سہول صاحب کہ اس زمانے میں دارالعلوم دیوبند کے مدرس تھے دارالعلوم مذکورہ میں تدریس کی خدمت انجام دینے لگا۔

**مطبع قاسمی:۔** دارلعلوم دیوبند میں آیا تو مطبع قاسمی عروج پر تھا. حضرت مولانا حبیب الرحمٰن (رحمتہ اللہ علیہ) مددگار مہتمم دارالعلوم دیوبند سے کنزالدقائق کے تحشیہ کا ذکر کیا. ممدوح نے ہمت افزائی کی۔

یہ تحشیہ ابھی شروع بھی نہ ہوا تھا کہ حضرت مولانا سید سراج احمد صاحب مدیر القاسم والرشید نے فرمایا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے نورالایضاح کے تحشیہ کا حکم دیا ہے. اس کی تعمیل تم کردو. چنانچہ میں نے نورالایضاح کا تحشیہ کیا. اس حاشیہ کی کل حقیقت اس قدر تھی کہ مراقی الفلاح اور طحطاوی کی بعض عبارتوں کا فارسی ترجمہ کہیں بین السطور اور کہیں حاشیہ تھا۔

نورالایضاح اپنے خصائص کی بنا پر مدارس اسلامیہ میں محتاج الیہ بن چکی تھی اور چونکہ اس میں زکوٰۃ اور حج کا ضمیمہ بھی ساتھ کر دیا تھا اس لئے اس حاشیہ کو بہت پسند کیا گیا. مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ تعلیق تشنہ ہے اور جب میں حضرت مولانا الحاج المولوی الحافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی ہمرکابی میں حیدرآباد دکن بسلسلۂ افتاء گیا تو وہاں اپنا زائد وقت اس کے تحشیہ جدیدہ میں صرف کیا. ایک مرتبہ تسوید کی. اور دوسری مرتبہ تبییض ۔

یہ حاشیہ مطبع قاسمی دیوبند میں طبع ہوا مگر کارکنان مطبع کی بے توجہی سے نہ طباعت عمدہ ہوئی نہ کتابت. مگر یہ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا. اس کو دوبارہ کتب خانہ انصاریہ دیوبند نے طبع کیا. اور بہت خوش نما طبع کیا. اس کے بعد بہت سے لوگوں نے اس کو چھاپا مگر مطبوعہ کتب خانہ انصاریہ کی طرح نہ چھاپ سکے۔

دیوان حماسہ :۔ نورالایضاح کے حاشیہ کی طباعت ہو ہی رہی تھی کہ خود ہی دیوان حماسہ کا خیال آگیا. میں نے بزمانہ طالبعلمی اس کے پڑھنے میں بڑی بڑی دقتیں اٹھائی تھیں. اور کتابت و طباعت کے ناقابل استفادہ ہونے کی وجہ سے گویا کہ کوہ کندن و کاربر آوردن کا مصداق تھا۔

کنزالدقائق کے تحشیہ سے پہلے اس کا تحشیہ شروع کر دیا. حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سنا تو تحسین فرمائی. اس حاشیہ کی حقیقت صرف اس قدر تھی کہ ابتدائی اوراق کے علاوہ بقیہ میں زیادہ تر عبارتیں فیضی شارح دیوان حماسہ کی تھیں اور تھوڑا سا حصہ تبریزی کا بھی تھا. تسہیل الدراسہ سے صرف اس قدر استمداد کرتا تھا کہ شعر کے معنی کے متعلق مترجم کی رائے معلوم کر لوں۔

میں نے چاہا کہ میں ماخوذ عنہ یا منقول عنہ کا حوالہ دوں مگر کارکنان مطبع نے کہا کہ اگر اس کے حوالے دیئے جاویں گے تو دیگر مطابع کو بلا اجازت کر لینے میں سہولت ہوگی. چنانچہ کنزالدقائق کے حاشیہ میں یہی صورت پیش آئی کہ بعض موقر اہل مطابع نے اس کو بجنسہ مع حوالجات کے طبع کر لیا صرف وہ عبارتیں ساقط کر دیں جو میرے نام سے تھیں. اسی وجہ سے حوالوں کی نہ کتابت ہوئی نہ طباعت، کاتب نے حاشیہ کے صفحہ کو خالی دیکھ کر ہر صفحہ کے آخر میں میرا نام لکھ دیا۔

دیوان حماسہ کا یہ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوا. لامیۃ المعجزات، قصیدہ اخلاقیہ کے تراجم شائع ہوئے اور آخر وہ وقت آیا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہما کی وفات ہوئی۔

فلک کی رفتار کج کے شکوے بتاؤ کس سے کروں میں جاکر ہزاروں نقشے بگاڑ ڈالے بنا بنا کر بنا بنا کر

میں ان حضرات کے زمانۂ حیات میں بھی اس سے غافل نہ تھا کہ اگر یہ مقدر ہے کہ میں ان کے بعد دنیا میں رہوں تو یقیناً یہ حضرات اپنے الطاف و احسانات کی وجہ سے اکثر یاد آیا کریں گے، مگر سچ یہ ہے کہ یہ خیال وسوسہ کے درجہ میں بھی نہ تھا کہ ان کی یاد زندگی کے ہر ہر لمحے میں ستائے گی۔

کیسی کیسی صورتیں آنکھوں سے پنہاں ہو گئیں    کیسی کیسی صحبتیں خواب پریشاں ہو گئیں

اس وقت اگرچہ مطبع قاسمی جناب مولانا مولوی محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور جناب مولوی قاری حافظ محمد طاہر سلمہما کے نام منتقل کیا جاچکا تھا، مگر مالکانہ تصرفات اور احکام موخرالذکر ہی کے جاری تھے اسی زمانہ میں دیوان حماسہ کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا اور مطبع قاسمی ہی نے شائع کیا، اس ایڈیشن کی کتابت، طباعت، کاغذ، غرض کہ ہر چیز مسخ تھی اور فی الواقع ناقابل استفادہ تھا، مگر چونکہ اس کے ساتھ اردو کا ترجمہ بھی تھا جو غالباً تسہیل الدراسہ سے لے لیا گیا تھا اس لئے اس کے تمام نقائص پر پردہ پڑا رہا اور یہ ایڈیشن بھی بہت جلد فروخت ہو کر کمیاب ہو گیا، اور طلبہ آج بھی اس کو اضعاف مضاعف قیمت پر خرید لیتے ہیں۔

دیوان حماسہ کا تیسرا ایڈیشن میرے عزیز دوست جناب مولوی سید احمد صاحب مالک کتب خانہ اعزازیہ دیوبند نے طبع کرایا میں نے اس کے سابقہ حاشیہ پر بہت سے اضافے کئے، استاذ نے بوقت درس جو کچھ بتایا تھا اس کا بھی کچھ حصہ اس میں آگیا، تبریزی کی تحقیق بھی اس میں آگئی، حماسی شعراء کے حالات دوسری کتابوں سے نقل کئے، غرض یہ کہ عرق ریزی میں کمی نہ کی۔

کتب خانہ اعزازیہ کے مالک نے اس کی طباعت بہت زیادہ اہتمام کے ساتھ کی، بے دریغ زر کثیر صرف کیا، اور نہایت آب و تاب سے شائع کیا۔

کنزالدقائق کے تحشیہ میں اس کی شروح وغیرہا سے امداد لی، دیوان متنبی کی تعلیق کے لئے العرف الطیب، واحدی، عکبری، سے استفادہ کیا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قصیدہ بائیہ کا ترجمہ نہ کرنے کا قلق رہا، یہ قصیدہ لامیہ المعجزات کی طرح سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا گرانمایہ خزانہ ہے، لیکن اس کے سمجھنے کے لئے واقعات کی تفصیل ضروری ہے، حضرت ممدوح نے ان واقعات

کو خصائص کبریٰ للسیوطی سے لیا ہے، اور دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں جو نسخہ اس کا داخل کتب خانہ ہے اس پر پنسل سے نشان دیئے ہیں، ایک قسم کا نشان لامیہ المعجزات کے لئے لکھے ہوئے معجزات کا ہے، دوسری قسم کا نشان ان معجزات کے لئے ہے جو بائیہ کے لئے لکھے گئے ہیں میں نے اس تفصیل سے اس طمع کی بنا پر لکھا ہے کہ شائد میرے احباب میں سے کوئی صاحب اس کے لئے من جانب اللہ موفق ہوں۔

"القاسم" و "الرشید" :۔ مدرسہ اسلامیہ دیوبند کی روئداد کے ابتدائی اوراق خود حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھا کرتے تھے، ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ میں اس طرح لکھتا ہوں کہ اگر کسی وقت کسی کا ارادہ ہو کہ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ مرتب کرے تو یہ روئدادیں اس کے اس ارادے کی اچھی خاصی معین ہو سکیں۔

مگر وہ عدیم الفرصت زیادہ تھے، اس لئے روئداد کی اشاعت میں بعض مرتبہ زائد از حد توقف ہو جایا کرتا تھا، ایک مرتبہ ان کو بالکل فرصت نہ ملی، تو جناب منشی منظور احمد صاحب مرحوم نے کہ روئداد کی طباعت و اشاعت کا تعلق انہیں سے تھا مجھ سے فرمایا کہ روئداد میں فلاں عنوان باقی ہے اگر تم لکھ دو تو روئداد کی تکمیل ہو جاوے، میں نے تعمیل کی، انہوں نے میری اطلاع کے بغیر میرا یہ مسودہ حضرت مولانا ممدوح کی خدمت میں پیش کر دیا، ممدوح نے میرا خط پہچان لیا، اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا، اور اس کے بعد سے روئداد مذکور کے ابتدائی اوراق کی تحریر میرے ذمہ ہو گئی، کبھی کبھی بعض بعض عنوانات بتا دیا کرتے تھے، اس مضمون نویسی کے سلسلے میں میرا نام کسی جگہ بھی نہ تھا۔

یہ مصروفیت میرے لئے بڑی مصروفیت تھی کہ حضرت مولانا سید سراج احمد صاحب مدیر القاسم والرشید نے ان دونوں رسالوں سے دلچسپی کم کر دی، اور نوبت بایں جا رسید کہ آٹھ آٹھ نو نو ماہ کے بعد کبھی القاسم کبھی الرشید شائع ہونے لگا، خریداران رسالہ میں اس حد تک کمی ہو گئی کہ غالباً پانسو (۵۰۰) بھی نہ تھے، حضرت مولانا ممدوح الصدر کو اس کی گرانی تھی، میں نے ان کے ایما سے ان دونوں رسالوں کی خدمت شروع کر دی۔

میرا نام مضمون نگاروں میں رہا، مدیر کی طرف سے مضامین بھی میرے ہی ہوتے تھے مگر

حضرت مولانا سید سراج احمد صاحب کے نام سے، گویا مضمون نگاری ہی کا کام میں کرتا تھا، احکام انہیں کے جاری ہوتے تھے۔

**دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا:۔** القاسم میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ایک مضمون بعنوان "دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" شروع کیا، حضرت ممدوح اپنے طرز تحریر کے خود ہی واحد مالک تھے، اس مضمون کی دھوم مچ گئی، یہ مضمون باقساط القاسم میں شائع ہوا، اور ابھی مکمل نہ ہوا تھا کہ القاسم بند ہو گیا، مطبع قاسمی کے کارکنوں نے اس کو القاسم کے پرچوں سے نقل کرا کر یکجائی شائع کر دیا۔

مجھ کو معلوم ہے کہ حضرت ممدوح نے اس کو پسند نہ کیا، ان کی رائے اس بارے میں بہت اونچی تھی، وہ چاہتے تھے کہ اس پر نظر ثانی کر کے ترمیم کی جاوے، واقعات کے حوالے دیئے جاویں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں ان کی کچھ نہ چلی، کتاب شائع ہوئی اور بہت مقبول ہوئی۔

میں نے اپنی مضمون نگاری کے سلسلے میں ایک مرتبہ کچھ بسط کے ساتھ یہ لکھا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی اس کتاب کو دنیائے علم نے بنظر استحسان دیکھا، خواص و عوام میں اس کی مقبولیت ہوئی، مگر اس تصویر کا دوسرا رُخ بھی سامنے لانا ضروری تھا جس کا عنوان یہ ہوتا کہ "دنیا کو اسلام سے کس کس طرح روکا گیا" جس کا مطلب ہوتا کہ اسلام فطرت انسانی کے مطابق ہونے کی وجہ سے مقبول خاص و عام تھا، دنیا اس کے سامنے سر جھکانے کے لئے بے چین تھی، اور جس طرح شمع سے پرانوں کو روکا جاتا ہے اسی طرح خدا کے راستے سے بھٹکے ہوؤں کو دین حق کی طرف آنے سے روکا جاتا تھا۔ پرستاران توحید کو روکنے کے لئے جس بہیمیت اور درندگی کو ضروری سمجھ لیا گیا تھا وہ اگرچہ

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن     خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

کے موافق اسلامی طغیانی کو روکنے کے لئے ناکافی تھا، تاہم ان بے پناہ مظالم نے کفر کو سطح زمین سے معدوم نہ ہونے دیا، اور صرف یہ تجویز ہی پیش نہ کی بلکہ بعض واقعات کو لکھ کر نمونہ بھی پیش

کر دیا۔ علام الغیوب ہی جانے کہ اس تجویز میں کیا مقناطیسی اثر تھا کہ اطراف وجوانب سے اس کی تائید ہوئی، اخبارات ورسائل نے اس کی اہمیت تسلیم کی، خطوط میں اس پر اصرار شروع ہو گیا، حتیٰ کہ کتاب "اشاعتِ اسلام" مصنفہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ نے تقریظی کلمات لکھے تو میری اس تحریک کی تائید بھی بہت زیادہ کی، اور "البوادر النوادر" میں تو یہاں تک شائع ہوا کہ اگر اعزاز علی اس قرار کو پورا نہ کر سکے تو کوئی دوسرے صاحب قلم اس خدمت کو انجام دیں، اور اسی سلسلہ میں مجھ کو اعزاز العلماء کا خطاب دیا جو میرے لئے سرمایۂ آخرت ہے کانگریس اور جمعیت العلماء متفق ہو کر حکومت برطانیہ کو ہندوستان بدر کرنا چاہتی تھیں، گرفتاریوں پر گرفتاریاں شروع ہو گئی تھیں کہ حضرت الاستاذ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی بھی برطانوی اقتدار کے زیر سایہ ملتان جیل میں ڈیڑھ سال کے لئے مہمان کر دیئے گئے۔

میں نے الجمعیت دہلی میں اس گرفتاری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ میں اس اسارت میں اپنی مذکورۂ بالا کتاب لکھوں گا اور حضرت الاستاذ کے نامِ نامی سے معنون کروں گا۔

یہ زمانہ جوش کا زمانہ تھا، تائیدی اور اصراری خطوط آنا شروع ہو گئے۔ ایک رئیس صاحب نے تو وقت شروع سے تا ختم کتاب پچاس روپیہ ماہانہ بھی دینے کا وعدہ از خود کیا۔

میں نے ابھی اس کو شروع بھی نہ کیا تھا کہ علامہ مودودی اڈیٹر الجمعیت کے مغرورانہ خطوط نے اس ارادہ کو پامال کر دیا۔

اہتمامِ قدیم غالباً ۴۶، ۷ ۴ھ سے ختم ہو چکا تھا، ہم مدرسین ہی کی درخواست پر جو مولوی محمود صاحب کی تحریک پر تیار ہوئی تھی حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ نے اہتمامِ جدید کو منظور فرمالیا تھا۔

# دنیا کو اسلام سے کس کس طرح روکا گیا

صانع عالم جل مجدہ کے نزدیک انسان کا رتبہ کچھ اس قدر بلند تھا کہ قاصر نظریں وہاں تک شائد ہی پہنچ سکتی ہوں، یہی وجہ ہے کہ اس کو ایجاد کے دائرے میں محصور کرنے سے قبل اس کے پیدا کرنے کا اعلان کیا، اصحاب شکوک کے اقوال سنے، مجمل اور مفصل جوابات دیئے، سب سے پہلے انسان ( آدم ) کو مع رفیقہ حیات ( حواء ) کے جنت میں رکھا، پھر زمین پر قیام کا حکم دیا۔

نظرے بسوئے خود کن کہ تو جہان دلربائی     مفگن بخاک خود را کہ تو از بلند جائی
تو ز چشمِ خود نہانی تو کمال خود چہ دانی     چو دُر از صدف بروں آکہ بسے گرانبہائی

ملائکہ مقربین کی مسجودیت، وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا کا قابلِ صد غبطہ تاج ایسی معمولی چیز تو نہ تھی کہ ہر کس و ناکس اس کا اہل ہوتا۔

صرف اعزازات ہی کے ذریعہ ہی سے نوع انسانی کی عزت افزائی نہ کی گئی، بلکہ دنیا میں پہنچا کر اس کی مخفی اہلیتوں کو اجاگر کرنا اور دکھلانا بھی تھا کہ یہ تعظیم و تکریم بلاوجہ نہیں ہے، مراتب عالیہ کے ذروۂ عُلیا پر پہنچانے کے ارادے سے شیاطین کے دامِ تزویر سے بچانے کے لئے اس کو عقل کی پُرانوار شمع دی۔ ارضی و سماوی، انفسی شواہد اس قدر موجود کر دیئے کہ ان پر نظر کرنے کے بعد رب السموات والارض کی ربوبیت، خلاقِ عالم کی صفتِ خلق، مالکِ حقیقی کی ملک تام، قادرِ مطلق کی قدرت کاملہ وغیرہ وغیرہ صفات ذات وافعال کا انکار کر ہی نہ سکے۔

نور عقل کی تابانی میں یہ دلائل نہ صرف افلاک کی گردشوں، سیاروں کی حرکتوں، نجوم کے طلوع و غروب، آفتاب و ماہتاب کے ماموارنہ عروج و ہبوط سے ظاہر ہوتے تھے بلکہ زمین کے تنکے تنکے سے اور ذرہ ذرہ سے عیاں تھے، حتی کہ اگر ایک بادیہ نشین جزم ویقین کے طریقے پر یہ کہہ سکتا ہے کہ

اَلْبَعْرَۃُ تَدُلُّ عَلَی الْبَعِیْرِ وَآثَارُ الْاَقْدَامِ عَلَی الْمَسِیْرِ فَھٰذِہِ السَّمَاءُ ذَاتُ الْاَبْرَاجِ وَالْاَرْضُ ذَاتُ الْفِجَاجِ کَیْفَ لَا تَدُلُّ عَلَی اللَّطِیْفِ الْخَبِیْرِ

ترجمہ:۔ کسی جگہ اونٹ کا پائخانہ دیکھنے سے یقین ہوجاتا ہے کہ یہاں سے اونٹ گزرا ہے، کسی جگہ قدم کے نشانات دیکھ کر بے اختیار زبان سے نکلتا ہے کہ

؎ کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی، ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

تو پھر یہ برجوں والا آسمان، اور بڑے بڑے میدان والی زمین خالقِ عالَم کے وجود کا یقین کیوں نہ دلادے گی۔

تو ایک حقیقت شناس یوں بھی فرماسکتا ہے کہ

ہر گیاہے کہ از زمیں روید وحدہ لاشریک می گوید

**ارسال رسل اور اس کی حکمت:۔** قادر مطلق کے وجود، توحید، صفات قدیمہ کے یہ دلائل و براہین غیر محدود اور ان گنت تھے، ذرہ ذرہ سے عیاں تھے، مگر صرف انہیں لوگوں کے لئے مفید تھے جو آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہوں، قلوب اور عقول کو گتھیوں کے سلجھانے میں استعمال بھی کرتے ہوں۔ ہاں ان دلائل سے وہ لوگ ضرور بے بہرہ تھے جو دیکھتی ہوئی روشن آنکھیں رکھنے کے باوجود نابینا ہوں، سننے کی طاقت رکھنے والے کانوں کے ہوتے ہوئے بھی نپٹ بہرے ہوں، بیدار قلوب اور ہوشیار عقول کے مالک مگر دیوانے اور مجنون ہوں، اور

اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ

ترجمہ:۔ یہ لوگ انسان نما بہائم ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم گشتہ راہ ہیں۔(الاعراف:۱۷۹) کا خطاب حاصل کرنے میں مگن ہوں۔

ضروت تھی کہ ان بصارت والے بے بصیرت لوگوں کے دلائل میں کچھ اور قوت پیدا کی جاوے تاکہ سوتے ہوؤں کو جھنجھوڑیں، اندھوں کو دیکھنے پر مجبور کریں، بہروں کو چیخ چیخ کر سنادیں، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ عقبۂ کؤد بھی حائل تھا کہ خالق و مخلوق میں کوئی مناسبت نہیں، مَلِکِ قدوس میں اور نطفۂ حقیرہ سے پیدا ہونے والے مملوک میں کوئی مابہ الاشتراک نہیں، ذات خداوندی اگر ہر عیب سے پاک ہے تو نوع انسانی ہر عیب سے بھرپور، وہ منتہائے علو میں اور یہ کمال سفل میں، افادے اور استفادے کے لئے مفید اور مستفید میں تناسب شرطِ اول ہے۔

ضرورت رسالت کے لئے چند مثالیں:۔ چلّے کے جاڑوں میں سردی سے ٹھٹھرے ہوئے شخص کو گرمی پہنچانے کے لئے اگر جلتی ہوئی آگ کے دہکتے ہوئے انگارے اس پر ڈال دیئے جاویں تو اس برفانی جسم میں گرمی پہنچے یا نہ پہنچے، مگر تھوڑی ہی دیر میں راکھ کا ڈھیر ضرور ہو جاوے گا، کیوں؟ صرف اس لئے کہ آگ سے بلاواسطہ حرارت کا استفادہ جسم انسانی کر ہی نہیں سکتا، چاول اور آگ بہت سے امور میں شریک ہیں، مگر اگر آگ کی حرارت سے فائدہ اٹھا کر چاول سے انسانی غذا کی قابلیت پیدا کی جاتی ہے تو یہ تو نہ ہو گا کہ چاول کو جلتی ہوئی آگ پر یا آگ کو چاولوں پر رکھ دو، اگر ایسا کیا تو ظاہر ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں پکے ہوئے چاولوں کے بجائے کالی کالی راکھ نظر آویگی، گیہوں کے آٹے سے اگر روٹی پکانی ہے تو یہ احمقانہ طریقہ ہو گا کہ آٹے کو آگ میں ڈالدیا جاوے، ان سب صورتوں میں واسطے کی ضرورت ہے، سردی سے ٹھٹھرے ہوئے انسان کو گرمی یوں پہنچائی جاسکتی ہے کہ انگیٹھی میں انگارے بھر کر اس کے پاس رکھ دو، انگیٹھی کے توسط سے آہستہ آہستہ حرارت اوس تک پہنچ سکے گی، چاولوں میں دیگچی کے توسط سے حرارت پہنچاؤ۔ گیہوں کے آٹے میں لوہے کے توے سے حرارت کا استفادہ کرو تو یہ صورتیں مفید ہونگی۔ اور چاول یا گیہوں انسان کے مفید غذا بنکر بدل ما یتحلل ہو سکیں گے۔

اسی طرح ذات خداوندی سے کملات کا استفادہ، اخلاق کا استکمال، مرضیات کا استعلام بلاتوسط ناممکن تھا، اس کی تجلیات اس سے زیادہ موثر ہیں جس قدر آگ جسم انسانی یا چاول وغیرہ کے لئے۔

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا (الاعراف: ۱۴۳)

ترجمہ:۔ ”پس ان کے رب نے جو اس پر تجلّی فرمائی، تجلّی نے اس (پہاڑ) کے پرخچے

اڑا دیئے۔"

میں اسی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسی لئے ضرورت تھی کہ عابد اور معبود کے درمیان میں کچھ ایسے قدسی صفات نفوس واسطہ بنیں جو عالمِ بالا سے خود استفادہ کریں اور عالمِ سفلی کے لئے افادہ کریں، ملاءِ اعلیٰ سے بھی تعلق تام رکھتے ہوں۔ اپنی روحانیت کے اعتبار سے ملکوتی صفات سے موصوف ہوں، دوسری جانب نوعِ انسانی سے بھی مناسبت تامّہ ہو تاکہ نہ استفادہ اور استفاضہ میں کوئی رکاوٹ ہو، نہ افادے اور افاضہ میں کوئی مانع ہو۔ انہیں نفوس مقدسہ متوسطہ کو انبیاء و رسل کہا جاتا ہے، جو لاؤڈ سپیکر کی طرح مقرّر کی آواز ہر ایک کان میں پہنچاتے ہوں ریڈیو کی طرح عالم میں نشر کرتے ہوں، ان کی بعثت اور توسط سے اصلی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ ناقص کو کامل اور کامل کو اکمل بنادیں، اہل غفلت کو غفلت سے نکالیں، نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کریں، بھاگے ہوئے غلاموں کو پکڑ پکڑ کر ان کے مالک تک پہنچادیں۔ نبوت و رسالت کے اسی فریضہ کی طرف آپ نے اپنی اس تقریر میں ارشاد فرمایا ہے کہ تم لوگ نار جہنم میں گھسے پڑتے ہو اور میں تمہاری کمریں پکڑ پکڑ کر پیچھے ہٹاتا رہتا ہوں۔

**انبیاء و رسل کا اتباع کامل:۔** چونکہ یہ نفوس قدسیہ اسی لئے ہوتے ہیں کہ احکام خداوندی مخلوق تک پہنچادیں گم کردہ راہوں کو صحیح راستے پر لادیں، اسی لئے ضروری ہے کہ از سرتاپا رضائے مالک الملکوت کا نمونہ ہوں، معاصی سے اس قدر دور ہوں کہ بعثت سے قبل بھی دانستہ یا نادانستہ شرک وغیرہ کبائر کے مرتکب نہ ہوں، تاکہ ان معاصی کی تلویث ان کے آئینہ قلب کو زنگ آلود نہ کردے کہ تجلّیاتِ الٰہیہ کی شعاعیں ان میں منعکس نہ ہوسکیں، ان کے قلوب اس صاف و شفاف شیشے کی طرح ہوتے ہیں جس کو اگر آفتاب کے بالمقابل کیا جاوے تو وہ آفتابی شعاعوں کو اپنے اندر جذب کرتا اور دوسری چیزوں پر ڈالتا ہے، اگر کبائر کا زنگ ان کے قلوب پر لگ گیا تو ان میں صلاحیت ہی نہ رہے گی کہ عالم علوی کے خطابات کی روشنی سے منور ہوں، پھر دوسروں ہی کو کس طرح منور کریں گے۔

انسان پر گزرنے والے تمام اطوار و ادوار ان پر بھی گزرتے ہیں. بھوک ان کو لگتی ہے.

پیاس ان کو لگتی ہے امراض میں یہ مبتلا ہوتے ہیں، صحت اور تندرستی ان کو ملتی ہے. دنیا کے غموم اور ہموم ان کے صبر و استقلال ثبات و استقامت کی آزمائش کرتے ہیں. دنیائے دنی کی ناپائندار خوشیاں ان کو ان کے مناصب عالیہ سے متزلزل کر دینے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتیں. مگر صبر و رضا کے یہ مجسمے. اطاعت و تسلیم کے پتلے کیا مجال کہ ایک بال برابر بھی اِدھر سے اُدھر یا اُدھر سے اِدھر ہٹ سکیں. ان حالات میں یہ حضرات جو کچھ کرتے ہیں وہ امتوں کے لئے صحیح لائحہ عمل اور طریقۂ رضائے خداوندی ہوتا ہے. اور اسی لئے نہ صرف یہ کہ ان کی عبادتیں قابل اقتدا اور لائق تقلید ہوتی ہیں بلکہ ان کا چلنا. پھرنا. سونا. جاگنا. کھانا. پینا. بھی اس لئے ہے کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ اس کا امتثال کرے۔

پھر اگر کوئی شخص اس کی تغلیط کرتا ہے کہ دنیا میں قبلہ ایک اور صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جس کو۔

**اوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ (آل عمران: ۹۶)**

ترجمہ:۔ وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو مکہ میں ہے۔

کی فضیلت عطا فرمائی گئی ہے تو غالبًا اس کی تغلیط قابل توجہ ہے. کیونکہ اس قبلے کی ضرورت نماز. حج. وغیرہما مخصوص عبادتوں کے سوا کسی اور موقع پر نہیں ہوتی ہے —— زکوٰۃ استقبالِ قبلہ بغیر ادا ہو جاتی ہے، روزے میں استقبال قبلہ کی حاجت ہی نہیں. اس سے زیادہ یہ کہ اسلام اور ایمان کے لئے اس قبلہ (خانۂ کعبہ) کا استقبال ضروری نہیں ہے جس پر تمام عبادات کی صحت کا مدار ہے۔

لیکن ایک قبلہ اور بھی ہے جس کی ضرورت ہر چھوٹی بڑی عبادت کے لئے ہے اور یہ قبلہ ایسا قبلہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس کے استقبال سے عبادت. عبادت ہوتی ہے. بلکہ اس کا استقبال غیر عبادت کو بھی عبادت بنا دیتا ہے. اس کے ذریعہ سے عادات و فطریات کو بھی عبادت ہی کی طرح تحصیل ثواب اور تقرب الٰہی کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے. پس اگر پہلی قسم کے قبلے کو قبلۂ خاصہ کہا جاسکتا ہے تو اس قبلے کو قبلۂ عامہ قرار دینا چاہئے۔

یہ قبلہ انبیاء علیہم السلام کی ذات اور ان کے افعال ہیں خانۂ کعبہ کی وجہ سے اگر بعض عبادتیں عبادتیں کہی جا سکتی ہیں، یا بعض عبادتوں میں ثواب آخرت کی زیادتی ہو سکتی ہے تو اس قبلے کی ضرورت سے نہ کوئی عبادت خالی ہے نہ عادت ــــــ میں اس کا منکر نہیں کہ بعض نمازوں میں استقبال قبلہ ضروری ہے، یعنی اگر انسان روبقبلہ ہو کر نماز ادا نہ کرے تو نیکی برباد گناہ لازم ہو جاتا ہے، کیونکہ نہ صرف یہ کہ نماز ہی فاسد ہوتی ہے بلکہ بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ ان میں استقبال قبلے کے بغیر نماز موجب کفر ہوتی ہے اور اہل علم جانتے ہیں کہ بعض نمازیں ایسی بھی ہیں کہ استقبال قبلہ کے بغیر بھی صحیح ہو جاتی ہیں۔ فقہ کا یہ مسئلہ غیر معروف نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص شہر سے باہر بحالت سواری سفر کر رہا ہے تو اس کی نماز استقبالِ قبلہ کے بغیر بھی ہو جاتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ جن نمازوں کے لئے استقبال قبلہ شرط ہے ان میں بھی استقبالِ قبلہ علےٰ وجہ الکمال ضروری نہیں ہے، بلکہ خانۂ کعبہ کے قُرب وبُعد، بلندی و پستی کے اعتبار سے اگر تھوڑا سے انحراف بھی ہو جاوے تو نہ نماز کی صحت میں کچھ فرق آتا ہے نہ ثواب میں کچھ کمی ہوتی ہے۔

شائد آپ نے بھی سنا ہو کہ ایسے بعض حضرات جنہیں علم ہیئت میں معلم حقیقی جلَّ مَجدُہٗ نے کچھ تھوڑی سی شدھ بدھ دیدی ہے ہندوستان کی عام مساجد کو قبلہ سے منحرف بتاتے ہیں، اور خداوند قدوس کی درگاہ میں سربسجود ہونے والوں کے قلوب میں شکوک و وساوس پیدا کرتے ہیں سو یہ ان حضرات کے علم ناتمام کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں۔

ایسے اوہام سے قطع نظر کر لینے کے بعد اگر کتب مذہب کا مطالعہ کیا جاوے تو اس میں تامل کی کوئی وجہ ہی نہ ہو کہ ہر ایک نماز میں خواہ کوئی صورت کیوں نہو استقبال قبلہ شرط نہیں ہے بلکہ بعض نمازوں میں استقبال قبلہ شرط ہے اور بعض میں نہیں، اور جہاں استقبال قبلہ شرط ہے وہاں بھی یہ ضروری نہیں کہ نمازی پورے طور پر روبقبلہ ہو بلکہ تھوڑے سے انحراف کے باوجود بھی نماز صحیح اور قابل قبول ہوتی ہے۔ لیکن انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے افعال و اعمال، اقوال و اخلاق، ایسا قبلہ ہیں کہ انسان کا فعل یا قول، عادت یا عبادت جس قدر ان کی سیدھ میں ہو گا اسی قدر زیادہ قابل قبول ہو گا اور جس قدر اس سے منحرف ہو گا اسی قدر ثواب کم ہو گا بلکہ بعض صورتوں میں وبال جان اور موجب عذاب ہو گا۔

مسلمان کا ہر عمل موجبِ ثواب ہو سکتا ہے۔ اعمال میں نماز کا درجہ بہت بڑا ہے، اس کی تاکید سے قرآن اور احادیث کے ذخائر بھرے ہوئے ہیں اَوَّلُ مَا یُحَاسَبُ بِہِ الْعَبْدُ الصَّلٰوۃُ. سب سے پہلے قیامت کے دن نماز ہی کی جانچ ہوگی اسی کے بارے میں فرمایا گیا ہے، لیکن اگر کوئی شخص شرعی اجازت کے بغیر قبلے سے پیٹھ پھیر کر نماز پڑھے تو موجب کفر ہے، اسی طرح بہت سے مواقع میں اگر انسان ان قدسی صفات نفوس کے بتائے ہوئے طریقے کے، یا ان کے افعال کے خلاف کرے تو خسارے میں رہتا ہے۔

اور یہ امر صرف عبادات ہی میں نہیں ہے بلکہ ان اُمور میں بھی ہے جن کو انسان اپنے اور اپنے بدن کی راحت کے لئے کرتا ہے، مثلاً سرمہ لگانا نور بصارت کی افزائش کے لئے ہے، اس سے ان دو آنکھوں کو نفع پہنچتا ہے جن کے بغیر انسان کی زندگی موت سے بھی بدتر ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص رات کو سرمہ لگاتا ہے، سوتے وقت لگاتا ہے، ہر ہر آنکھ میں تین تین دفعہ لگاتا ہے، اور یہ سب کچھ اس لئے کرتا ہے کہ سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ والتحیات کا حکم ہے خود آپ نے اس پر عمل فرمایا ہے، آپ کی اقتداء مدِّ نظر ہے از دیاد بصر تو اس صورت میں ہاتھ سے گیا ہی نہیں موجب حصول ثواب بھی ہے، رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

پانی پینا پیاس کی تسکین کا سبب ہے، لیکن اگر پانی اس طرح پیا جاوے کہ فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے مثلاً بیٹھ کر پیئے، دو یا تین سانس لیکر پیئے، اور ہر مرتبہ برتن کو منہ سے جدا کرتا ہے، اور یہ سب اس لئے کرے کہ آپ کے افعال واقوال کا اتباع کرتا ہے تو یہ پانی پینا بھی ثواب ہے، رہا پیاس کا بجھ جانا تو وہ تو حاصل ہو ہی گیا۔

سونا فطری چیز ہے، نیند نہ آنا مرض ہی نہیں بلکہ ام الامراض ہے، جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے انسان اطباء اور ڈاکٹروں کے دروازے کھٹکھٹاتا ہے اور انکی ناز برداری کرتا ہے، نہ سونے کی وجہ سے انسان نیم مردہ معلوم ہوتا ہے نیند آجاتی ہے، تو کس قدر راحت ملتی ہے، مگر یہ راحت صرف بدن کی راحت ہوتی ہے، آخرت سے اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے، لیکن اگر داہنے ہاتھ کی ہتھیلی پر داہنا رخسارہ رکھ کر، داہنی کروٹ پر اس لئے سوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح استراحت فرمایا کرتے تھے تو فوائدِ بالا کے علاوہ آخرت کا ابدی ثواب بھی حاصل ہوتا ہے۔

قضائے حاجت فطری چیز ہے، اس کے بغیر زندگی دوبھر ہے، انسان تو بجائے خود جانور بھی اس پر مجبور ہیں۔ غذا کے فضلات زائدہ کو جو درحقیقت زہریلے اجزا ہیں جانور بھی خارج کرتے ہیں اور انسان بھی، دونوں میں فرق نہیں، لیکن اگر قضائے حاجت کرنے والا انسان قضائے حاجت اس طرح کرے کہ نہ قبلے کی جانب منہ ہو نہ پیٹھ، استنجا بھی اسی طریقے سے کرے جس طرح صاحب شریعت نے خود کیا اور دوسروں کو تعلیم دی تو یہ بھی ثواب سے خالی نہیں۔

مرد کو عورت کی فطری ضرورت ہے، بہت سے امور میں ایک کا دوسرا محتاج ہے، اور اسی لئے ہرایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور مراعات کرنے پر مجبور ہے، دونوں میں سے ہرایک کا آرام ہرایک کی راحت اسی پر موقوف ہے کہ دونوں باہم خوش رہیں، اور یہی وجہ ہے کہ جس جگہ نکاح رائج نہیں ہے وہاں حرامکاری زیادہ ہے، لیکن اگر نکاح اس لئے ہو کہ۔

مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِىْ فَلَيْسَ مِنِّىْ۔

یعنی "جو میری سنت سے منہ پھیرے وہ مجھ میں سے نہیں ہے" اور

اِنِّىْ اُبَاهِىْ بِكُمُ الْاُمَمَ

یعنی "میں تمہارے ذریعہ دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔"

پیش نظر ہے، زوج کو زوجہ کی، اور زوجہ کو زوج کی پاسداری اس لئے ہے کہ ارشادات نبویہ میں اس کی تاکید موجود ہے تو یہ تمام حظوظ عبادات کی طرح موجب ثواب ہو جاتے ہیں۔

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ملا علی قاری رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے بڑی جدوجہد کے ساتھ اپنے لئے ایک نئے مکان کی تعمیر کی، ہزاروں روپیہ بھی صرف کئے، اور سالہا سال کی عمر برباد کی، جب یہ مکان تعمیر ہو گیا تو اس خوشی میں اپنے شیخ کی دعوت کی، شیخ تشریف لائے، میزبان نے شیخ کو اپنی نشست کے کمرے میں پہنچایا۔ کمرہ عروس نو آراستہ کی طرح مزین تھا، شیخ نے کمرے پر سرسری نظر ڈال کر فرمایا کہ عزیز من! دیوار میں اوپر کی جانب اس قدر بڑا سوراخ کیوں ہے۔ میزبان نے مودبانہ انداز میں عرض کیا کہ حضرت یہ روشندان ہے، اس کے بنانے سے غرض یہ ہوتی ہے کہ آفتاب کی روشنی اندر آسکے، اگر یہ نہ ہو تو اس جگہ تاریکی ہوتی، شیخ نے فرمایا کہ خدا کے بندے! تم نے سارا کیا کرایا ہی برباد کر دیا، اگر تم اس کو اس ارادے سے بنواتے کہ

ادھر سے اذان کی آواز آیا کرے گی تو ہم کو مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے جانے میں آسانی ہوگی تو آفتاب کی روشنی تو بہر صورت آتی، مگر اس ارادے کی وجہ سے مال کا صرف کرنا، اپنے عزیز اوقات کو اس میں لگانا یہ سب کچھ موجب اجر ہوتا، اب تو صرف روشنی ہی آیا کرے گی ثواب نہ ملے گا۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ اَلْمُؤْمِنُ بِکُلِّ حَالٍ عَلٰی خَیْرٍ یعنی ایماندار تو ہر حالت میں اچھا ہی رہتا ہے خواہ مبتلائے غم ہو، یا آرام وراحت سے بسر کرتا ہو، مصائب اور آلام میں گرفتار ہو کر انبیاء کی اقتداء میں صبر کرتا ہے اور عیش وراحت میں رہ کر شکر کرتا ہے، ثواب اس میں بھی اور اس میں بھی۔

اس سے واضح ہو گیا کہ انبیاء علیہم السلام کی ذات، ان کے صفات، ان کے اعمال، ایسے قبلے ہیں کہ ہر عمل میں اُن کی ضرورت ہے، جو عمل عادت ہو یا عبادت ان کی سیدھ میں نہ ہو گا وہ عبادت کہلائے جانے کا مستحق نہ ہو گا۔ اور اس صورت میں اگر ان کو قبلہ عامہ کہا جاوے تو بے جا نہیں ہے، کیونکہ اس قبلے کی ضرورت ہر عمل میں ہے اور خانہ کعبہ قبلہ خاصہ ہے جس کی ضرورت صرف چند اعمال میں ہے، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انسان کے لئے تقرب الی اللہ حاصل کرنے کے ایک نہیں بلکہ دو قبلے ہیں، ایک قبلہ ایسا ہے کہ اس کے استقبال سے بعض عبادتیں عبادت ہو جاتی ہیں اور ایک قبلہ ایسا ہے کہ اس کی سیدھ میں ہونے سے مباحات بھی عبادت ہو جاتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ کَیْفَ نَشْکُرُکَ وَکَیْفَ لَا نَشْکُرُکَ

ترجمہ:۔ اے اللہ ہم کیسے آپ کا شکر ادا کریں اور آپ کا شکر کیوں نہ ادا کریں۔

یہیں سے خود تراشیدہ رسوم یا مخترعات اور حسنات مشروعہ کا فرق بھی معلوم ہو گیا، اول الذکر قبلہ عامہ سے منحرف ہیں اگرچہ وہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں، اور موخر الذکر قبلہ عامہ کی سیدھ میں ہیں اگرچہ ان کے کرنے سے حظوظ نفس کم ہو یا بالکل نہ ہوں۔

**سنت اور بدعت کا فرق:۔** فرض کیجئے کہ کسی ایک محلے یا کسی شہر میں دو مسجدیں ہیں، ایک تو اس قدر وسیع ہے کہ بیک وقت اُس میں ہزاروں انسان سما سکتے ہیں پھر اُس کی تعمیر میں ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں روپیہ بھی خرچ کیا گیا ہے، سنگ مرمر کا فرش اُس میں ہے

ابیض، احمر، اسود غرض کہ ہر قسم کے پتھروں کی چپہ کاریاں اُس میں ہیں، عمدہ دریاں اور قالین اُس میں بچھے ہوئے، شمع فانوس سے وہ جگمگاتی ہے، کتبے دیواروں پر آویزاں بھی ہیں اور منقوش بھی، گرم پانی کا ذخیرہ اُس کے لئے موجود ہے، ٹھنڈے پانی کا اُس میں سامان بجلی کی روشنی، اور برقی پنکھے۔ غرض یہ کہ کوئی چیز ایسی نہ ہو جو مسجد کی زیبائش کے لئے یا نمازیوں کی سہولت کے لئے ہو سکتی ہو اور اس مسجد میں نہ ہو، زیب و زینت کے اعتبار سے اگر اُس کو فرعون کا قصر کہا جاوے تو بے جا نہیں، لیکن نقصان اس میں صرف یہ ہے کہ وہ قبلہ سے منحرف ہے، نمازی اس میں روبقبلہ ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا ہے، اسی محلے یا شہر میں ایک دوسری مسجد فرض کر لیجئے، جس کی زمین بھی خام، چھت بھی بوسیدہ کہ ہر وقت مٹی جھڑتی ہے اور گھانس اور پھوس کی ہے، تیز ہوا چلے تو اندیشہ ہو کہ دیواریں اور چھت زمین پر آجاویں گی تھوڑی سی بارش ہو تو اندرونی و بیرونی دونوں حصوں میں نماز پڑھنی دشوار، موسم سرما و گرما میں موسمی ہواؤں کی تیزی مسجد میں داخلہ سے مانع ہو، وضو کے لئے برتن ہیں مگر مٹی کے اور وہ کثیف اور میلے، کائی ان پر جمی ہوئی، سقایہ تو نہیں کہ جس میں پانی بھرا ہوا ہو، ایک کچا کنواں ضرور ہے اس پر بھیگی ہوئی رسی اور ڈول رکھا ہوا ہے ضرورت ہو تو پانی خود بھر لیجئے ان تمام تکلیف دہ امور کے باوجود اس میں ایک اچھی چیز بھی ہے اور وہ یہ کہ قبلے سے منحرف نہیں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص پہلی مفروضہ مسجد میں استقبال قبلہ کے بغیر نماز پڑھے تو کتب مذہب میں اس کی تکفیر ملے گی، اور اگر اس دوسری مفروضہ مسجد میں نماز پڑھی جاوے تو تمام دشواریوں کے ہوتے ہوئے بھی اس کی نماز بلا کراہت صحیح ہے، اور اگر یہ نماز با جماعت ہے تو حسب تصریح کتب احادیث اُس کو پچیس یا ستائیس نمازوں کا ثواب ملے گا۔

آخر یہ فرق کیوں ہے، پہلی خوش نما مسجد تو لاکھوں اور کروڑوں روپیہ کے صرف سے تعمیر کی گئی ہے اور بقول بعض ایسی بے نظیر مسجد سے اسلام کی شوکت اور اہل اسلام کا رعب غیر مسلموں پر پڑتا ہے دوسری خام مسجد تو مسلمانوں کی فلاکت، شکستہ حالی، بے توجہی کی آئینہ اور شاہد عدل ہے پھر ایک مسجد میں تو نماز کا ادا کرنا ہی کفر، اور دوسری حقیر مسجد میں نماز مقبول اور موجب ازدیاد ثواب۔

اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہے کہ یہ عظیم فرق اس لئے ہے کہ ایک مسجد روبقبلہ ہے

اور دوسری منحرف عن القبلہ. اس سے ظاہر ہو گیا کہ مسجد کا شاندار ہونا یا نہ ہونا نماز کی صحت. رضائے خداوندی، تقرب الی اللہ میں مؤثر نہیں ہے نہ قابلِ التفات ہے اگر مؤثر اور واجب الالتفات ہے تو استقبالِ قبلہ. یہ ہے تو عبادت عبادت ہے ورنہ گناہ ہے اور بڑا گناہ ہے۔

یہی فرق ہے بدعات میں اور امور مسنونہ میں. بدعات قبلہ اعمال سے منحرف ہوتی ہیں اور امور مسنونہ اس کی سمت میں ہوتے ہیں. اسی لئے یہ صحیح ہے کہ اگر بڑی سے بڑی بدعت بھی کی جاوے تو موجب ثواب تو یقیناً نہ ہوگی. ہاں اگر زیادہ انحراف ہے تو گناہ بھی ضروری ہے. اور امور مسنونہ اگرچہ چھوٹے چھوٹے اور (نعوذ باللہ) زیادہ وقیع معلوم نہ ہوتے ہوں صرف موجب ثواب ہی نہ ہوں گے بلکہ ایک درجہ اور بھی جس کو وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ یعنی اور اللہ جس کے لئے چاہے بڑھاتا ہے۔ سے ظاہر کیا گیا ہے۔

دفنِ میت کے بعد سینکڑوں من غلہ تقسیم کرنا. قبر پر اذان دینا تعزیہ بنانا. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جگر گوشہ (سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے مبارک نام پر پانی کی مشکیں بہانا. صلوٰۃ رغائب، وغیرہا وغیرہا میں ہمارے متخیلہ دلائل و خطرات کتنا ہی حسن ثابت کریں، لیکن جب ان میں قبلۂ اعمال ہی سے انحراف ہے تو سچ یہ ہے کہ ان کے محاسن محاسن نہیں بلکہ قبائح ہیں. اور اگر بعد از دفن، قبر میں۔

مِنۡہَا خَلَقۡنٰکُمۡ وَ فِیۡہَا نُعِیۡدُکُمۡ وَ مِنۡہَا نُخۡرِجُکُمۡ تَارَۃً اُخۡرٰی

ترجمہ:۔ (یعنی اسی زمین سے ہم نے تم کو بنایا اور اسی میں تم کو پھر لوٹا دیتے ہیں اور اسی سے نکالیں گے تم کو دوسری بار۔ طٰہٰ: ۵۵)

پڑھ کر تھوڑی تھوڑی مٹی تین مرتبہ ڈالدیں تو موجب اجر ہے۔

اس ساری گزارش کی تلخیص یہ ہے کہ انبیاء کی بعثت اس لئے ہوتی ہے کہ ان کو دیکھ کر. ان کے اعمال و اقوال بلکہ حرکات و سکنات کی بھی اقتدا کی جاوے، جس طرح ان کے فرمان قابل عمل ہوتے ہیں اسی طرح ان کی ہر حرکت و سکون لائق تقلید ہے. قادر مطلق نے انسان کو راہ راست پر رکھنے یا گم گشتوں کو صحیح راستے پر پہنچانے کے لئے مابین السماء والارض کو دلائل توحید اور قدرت مطلقہ کے براہین سے بھر کر وَفِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ (ترجمہ:۔ یعنی اور زمین

میں یقین لانے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خود تمہارے اندر۔ الذاریت. ۲۱،۲۰) فرمادیا ہے تو انبیاء کی ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد کے اعمال و افعال کو مرضیات الٰہیہ اور عبادات مرضیہ کے لئے نمونہ بنادیا ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک بادشاہ کسی کو ایک تعمیر کا مسلّمہ اور مجوّزہ نقشہ دے کر اُس کے موافق مکان کی تعمیر کا حکم دیتا ہے، کارکنانِ تعمیر اُس مجوزہ نقشہ میں اپنی رائے سے ترمیم کرتے ہیں، یا اُس نقشے کو بالکل ترک کر کے کسی دوسرے طرز کی عمارت بنادیتے ہیں، اور اپنی اس ترمیم یا تبدیل کے استحسان کے لئے قوی سے قوی دلائل بھی رکھتے ہیں، تب بھی ان تمام دلائل و براہین کا ذخیرہ یہ کہہ کر رد کیا جاسکتا ہے کہ تعمیر مذکورہ شاہی نقشہ کے خلاف ہے، اور اس کے انہدام کا حکم دینے کے لئے یہی ایک نقصان کافی ہے۔

ٹھیک اسی طرح سے بندگان خداوندی کی عبادتیں اگر اُسی نقشے کے مطابق ہیں جو انبیاء کی صورت میں احکم الحاکمین نے ان کو دیا ہے تو وہ اپنے اپنے درجہ پر قابل قبول اور موجب ثواب ہیں، لیکن ان میں ترمیم تغییر یا تبدیل کی گئی تو فرقِ مراتب کے ساتھ ثواب کی کمی، یا نیکی برباد گناہ کا لزوم بھی صحیح ہے، اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس میں حرج ہی کیا ہے یا یہ کہ اس میں محاسن زیادہ ہیں، اسلام کی شان و شوکت زیادہ معلوم ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ کیونکہ اس میں سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ مالک الملک، احکم الحاکمین جلّ مجدُہٗ کے دربار سے اعمالِ صالحہ کا جو نمونہ دیا گیا ہے اس کے مطابق نہیں۔

**بدعت باعثِ اجر نہیں:۔** ابن امیر حاج اپنے زمانہ کے کبار علماء میں سے ہیں، صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، بہت سے علماء ان کے حلقہ تلمذ میں داخل ہیں، اپنی کتاب مدخل میں تحریر فرماتے ہیں کہ بعض اکابر علماء نے حدیث میں دیکھا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ سے فرمایا کہ تم ہر فرض نماز کے بعد تینتیس مرتبہ اللہ اکبر اور تینتیس مرتبہ الحمد اللہ اور تینتیس مرتبہ سبحان اللہ اور اس سب کے بعد ایک دفعہ لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کہہ لیا کرو (سنن ابی داؤد ص ۲۱۸ ج ۱) اس حدیث کو دیکھ کر انہوں نے یہ خیال کیا کہ یہ مقدار کم ہے، اس لئے ان کلمات میں سے ہر ایک کو فرض نماز کے بعد سَو سَو دفعہ

پڑھنا شروع کر دیا، اور بہت دنوں تک اس پر عامل رہے۔

ایک روز بعد نماز عشاء سو گئے تو خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور ایک وسیع میدان میں دنیا کے چھوٹے بڑے سب جمع ہیں. یکایک آواز آئی کہ فرائض کے بعد تسبیح و تحمید و تکبیر کرنے والے کہاں ہیں ؟ ادھر آئیں. اور اپنا اپنا ثواب حاصل کریں. یہ سن کر بہت سے لوگ اس طرف دوڑے. انہیں کے ساتھ یہ بھی پہنچے. غالباً یہ خیال ہو گا کہ ان لوگوں میں پہلا درجہ میرا ہی ہو گا. کیونکہ میں نے بہت زیادہ مقدار شروع کر دی تھی۔ مگر وہاں جاکر دیکھا تو کسی نے پوچھا بھی نہیں ؎

نہ کوئی پوچھتا ہے اور نہ نام اس کا ہے دفتر میں ‏ ‏ ‏ بڑا دیوانہ ہے محسن کہاں آیا ہے محشر میں

تعجب ہوا. اور چونکہ اپنے عمل کی زیادتی کی وجہ سے مقبولیت کا یقین تھا. خیال ہوا کہ چونکہ مجھ کو ان سب سے زیادہ انعام ملنے والا ہے. اس لئے آخر میں دیا جاوے گا تاکہ سب دیکھیں. تمام حاضرین کو انعام ان کی موجودگی میں تقسیم کیا گیا. مگر ان کا نام بھی نہ آنا تھا. نہ آیا. بالآخر یہ از خود تقسیم کنندہ انعام کے پاس پہنچے. اور اس سے شکایت کی کہ بہت زیادہ عبادت کے باوجود مجھ کو محروم کر دیا گیا. اس نے کہا کہ تمہاری شکایت بے جا ہے. اس انعام کے حاصل کرنے والوں کی فہرست میں تمہارا نام نہیں ہے انہوں نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا غور کرتے رہے کہ خداوندی علم. نسیان. ذہول. خطا سے قطعاً منزّہ ہے ان عیوب کا علمِ خداوندی سے کوئی تعلق ہی نہیں پھر آخر میں کیوں محروم کر دیا گیا۔

سوچنے کے بعد معلوم ہوا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق نہ تھا بلکہ اس میں زیادتی کر دی گئی تھی. اسی لئے اس عبادت کا مخصوص ثواب نہ مل سکا۔

ابن امیر حاج کے اس بیان کئے ہوئے واقعے کو دیدۂ عبرت سے دیکھو اور گوش حق نیوش سے سنو. اور اپنے لئے اس کو دستور العمل بناؤ۔

وہی تکبیریں تھیں. اور وہی تحمید اور تسبیحیں جو فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی تھیں. مگر رویائے صادقہ کے ذریعے سے تنبیہہ کر دی گئی کہ چونکہ ارشاد نبوی کے خلاف ہے لہٰذا قابل تحسین نہیں۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ بندگان خدا اپنے اپنے اعمال و اقوال میں جس قدر منہاج نبوت سے قریب رہیں گے اسی قدر رحمت الٰہیہ کے مورد اور تقربات خداوندی کے مہبط

ہوں گے. اور جس قدر اس سے بُعد ہوتا جاوے گا اسی قدر خُسران اور حرمان سے قُرب ہوتا جاوے گا۔

مختصر یہ ہے کہ انبیاء اور رسل کی بعثت میں یہ مصلحت تھی کہ جس طرح کائناتِ عالم کا ذرہ ذرہ قادر مطلق کے وجود اور اس کی صفات کو علماً بتاتا اور ثابت کرتا ہے اسی طرح انبیاء اور رسل کی تشریف آوری، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق کی عملی تعلیم کرتی ہے اور اسی وجہ سے ضروری ہے کہ رسول انسان ہی ہوتا کہ نوع انسان کو باہمی ارتباط اور میل جول سے مدارج علمیہ اور عملیہ تک پہنچنے میں آسانی ہو۔

**رسول کا انسان ہونا ضروری ہے:۔** فرض کرو کہ رسول انسان نہ ہوتا بلکہ جنس ملائکہ میں سے ہوتا اور جس طرح لیلۃ الاسراء میں پچاس نمازیں فرض ہو کر فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار گزارش پر پانچ کر دی گئی تھیں اسی طرح اس رسول سے یہ پچاس نمازوں کی فرضیت کو فرمایا جاتا تو چونکہ یہ فرشتہ نہ انسان کے صنف سے واقف ہوتا نہ اس کی ضروریات و حوائج سے اس لئے تخفیف کی دعا تو ہرگز ہرگز نہ کرتا. اور اگر نظر کو ذرا وسعت دو تو شائد یہ خیال بھی غلط نہ ہو کہ یہ فرشتہ یوں کہتا کہ

بار الہا! پچاس نمازیں تو چند گھنٹوں میں ختم ہو جاویں گی یہ لوگ لیل و نہار کے بقیہ اوقات میں کیا کریں گے. تضییع اوقات سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ اس سے زیادہ ان پر نمازیں فرض کی جاویں۔ اور فرشتے کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ بے جا بھی نہ ہوتے. کیونکہ اس کو کیا خبر کہ انسان کن کن حاجات میں گرفتار ہے اور کن کن مواقع اور عوائق کا شکار ہے اسی طرح فرض کرو کہ رسول از نوع جن ہوتا اور حکم ہوتا کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کر لیا جاوے تو وہ یہی کہتا کہ الٰہی! یہ کیونکر ممکن ہے کہ پانی نہ ملے. مشرق، مغرب میں کہیں نہ کہیں تو پانی ملے گا. اور اگر انہار و بحار سبھی خشک ہو گئے ہوں اور زمین کے اوپر پانی کا ایک قطرہ نہ ہو تو زمین کے اندر سے نکال لینے میں کیا دشواری ہے۔

نمونے کی ان صورتوں سے ظاہر ہو گیا کہ انسان کے لئے رسول بھی انسان ہی ہونا ضروری تھا.

اگر انسان کے لئے انسان رسول نہ ہوتا تو چونکہ یہ رسول حوائج بشریہ. ضروریات انسانیہ سے ناواقف ہوتا تو انسان کی جان ضیق میں آجاتی۔

پس حکیم عَلَےالاِطلاق عُزَّ شانہٗ نے نبوت و رسالت کا مرتبہ بھی انسان ہی کو دیا. یہ ایسے قدسی صفات نفوس ہوتے تھے کہ روحانیت میں ان کا قدم ملائکہ سے بھی ہزار درجہ آگے ہوتا تھا اور اسی وجہ سے بذریعہ وحی احکام ربانی سے ان کو مطلع کیا جاسکتا تھا. اور دوسری جانب میں چونکہ صفات بشریہ سے موصوف ہوتے تھے اس لئے ان احکام نازلہ کی تعلیم ذرائع مختلفہ سے انسان کو کر سکتے تھے۔

**انسان کو جانوروں کی طرح آزاد نہیں رکھا گیا۔** حضرت آدم علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جنت الخلد سے زمین پر بھیج کر ان سے ان کی اولاد سے خالق عالم نے اپنا سایۂ رحمت نہیں اٹھالیا. رضائے خداوندی اور اطاعت الٰہی کے وادی ناپید اکنار میں ٹھوکریں کھانے کے لئے نہیں چھوڑ دیا. بلکہ معاملہ اس طرح رکھا کہ مخلوقات کا بہت سا حصہ حتیٰ کہ شمس و قمر بھی انسان کے لئے مگر انسان صرف اپنے پیدا کرنے والے کے لئے۔

اسی لئے اس کو عقل سلیم عطا فرمائی. ذرہ ذرہ اور تنکے تنکے کو قدرت کاملہ. وحدت مطلقہ کا شاہد اور مظہر بنایا. اور اسی پر بس نہ کی بلکہ انبیاء اور رسل کو متوالیاً متتابعاً معجزات و بیّنات عطا فرما کر بھٹکے ہوؤں کی ہدایت کا سامان مہیا کیا. کتابیں نازل کیں. جن میں ارضی انفسی. آفاقی ناقابل رد دلائل بیان کئے۔

غرض یہ کہ عباد اللہ کے لئے کوئی عذر باقی نہ رکھا. اور اگر اب بھی انسان اپنی دیکھنے والی چمکتی ہوئی آنکھوں کو ان کی جانب سے اندھا بنالے. سننے والے کانوں کو بہرہ. اور دنیا کے ہر نفع و نقصان کو سمجھ لینے والی عقلوں کو دنیا سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دے تو خدارا بتاؤ کہ ایسے لوگ اگر انسان نما بہائم نہیں تو آخر ہیں کیا؟

**اَبُنَیَّ اِنَّ مِنَ الرِّجَالِ بَہِیْمَۃً فِی صُوْرَۃِ الرَّجُلِ السَّمِیْعِ الْمُبْصِرِ فَطِنَ بِکُلِّ رَزِیَّۃٍ فِی مَالِہٖ وَ اِذَا اُصِیْبَ بِدِیْنِہٖ لَمْ یَشْعُرْ**

ترجمہ:۔ برخوردار من! بعض انسان دیدۂ بینا اور گوش شنوار کھنے کے باوجود جانور ہیں وہ ہر اس

نقصان کو معلوم کر لیتے ہیں جو ان کے مال میں ہو خواہ تھوڑا ہو یا بہت. نقصان قریب کے مال میں ہوا ہو یا دور کے مال میں لیکن اگر اس کا دین (سارے کا سارا) لوٹ لیا گیا ہو تو اس کے کان پر جوں بھی نہ چلے۔

**ارسالِ رُسُل کی حکمت قرآن سے:۔** ارسال انبیاء ورسل کی حکمت کو کلامِ ربّی نے اس طرح ظاہر فرمایا ہے کہ:

**رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا**

جس کی تفسیر بیان القرآن سورۂ نساء کے الفاظ میں یوں ہے۔

> یعنی ان سب کو (ایمان پر) خوشخبری (نجات کی) دینے والے اور (کفر پر عذاب کا) خوف سنانے والے پیغمبر بنا کر اس لئے بھیجا تا کہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے ان پیغمبروں (کے آنے کے) بعد کوئی عذر (ظاہراً بھی) باقی نہ رہے (ورنہ قیامت میں یوں کہتے کہ بہت سی اشیاء کا حسن وقبح عقل سے معلوم نہ ہو سکتا تھا پھر ہماری کیا خطا) اور (یوں) اللہ تعالیٰ پورے زور دار (اور اختیار) والے ہیں (کہ بلا ارسال رسل بھی سزا دیتے تو بوجہ اس کے کہ مالک حقیقی ہونے میں متفرد ہیں ظلم نہ ہوتا اور حقیقت عذر کا حق کسی کو نہ ہوتا لیکن چونکہ) بڑے حکمت والے بھی ہیں (اس لئے حکمت اسی ارسال رسل کو مقتضی ہوئی تا کہ ظاہری عذر بھی نہ رہے۔)

(النساء. ۱۶۵)

**انسان کی ابتداء:۔** حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام جنت الخلد میں رکھے گئے تھے. اس میں اختلاف ہے کہ بزمانہ قیام جنت ان کی اولاد ہوئی تھی. یا نہیں. بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ولادت کا سلسلہ زمین پر آجانے کے بعد ہی شروع ہوا تھا اور بعض کی رائے ہے کہ کچھ اولاد کا سلسلہ جنت ہی سے شروع ہو گیا تھا. قابیل اور اس کی بہن جنت ہی میں پیدا شدہ ہیں۔

حضرت آدم کی وفات سے قبل ان کی بالواسطہ اور بلاواسطہ اولاد چار لاکھ نفوس تک پہنچ چکی تھی۔
(البدایہ والنہایۃ ص ۹۲ ج ۱)

## حضرت آدم کی اصل :۔

**قَالَ النَّبِیُّ ﷺ اِنَّ اللہَ خَلَقَ اٰدَمَ مِنْ قُبْضَۃٍ قَبَضَھَا مِنْ جَمِیْعِ الْاَرْضِ فَجَاءَ بَنُوْ اٰدَمَ عَلٰی قَدْرِ الْاَرْضِ، فَجَاءَ مِنْھُمُ الْاَبْیَضُ وَالْاَحْمَرُ وَالْاَسْوَدُ وَبَیْنَ ذٰلِکَ، وَالْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ وَالسَّھْلُ وَالْحَزْنُ وَبَیْنَ ذٰلِکَ**

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا. بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ایک مٹھی خاک سے پیدا کیا جسے زمین کے تمام طبقوں سے حاصل کیا۔ اس لئے آدم کے بیٹے بھی زمین کے مزاج و خاصیت کے مطابق ہوئے۔ رنگ کے اعتبار سے کوئی ان میں سفید. کوئی لال. کوئی کالا اور کوئی ان رنگوں کے درمیانی رنگ کا ہوا۔ اور کوئی بری خصلت والا کوئی اچھی خصلت والا. کوئی نرم کوئی سخت مزاج اور کوئی ان مزاجوں کے درمیانی مزاج والا ہوا۔ (البدایہ والنہایہ ص ۸۵ ج ۱)

اس حدیث کے موافق انسان کی خلقت مختلف الطبع والالوان زمین کے اجزا سے ہوئی تھی اس لئے جس طرح ان کی صورتیں مختلف الالوان و الاجسام والاشکال تھیں اسی طرح ان کی سیرتوں میں کثیر اختلاف تھا. بعض حسن صورت. اور حسن سیرت دونوں سے متصف تھے. بعض قبح صورت اور قبح سیرت سے مربوط تھے. بعض حسن الصورت تھے مگر قبیح السیرۃ بعض قبیح الصورت تھے مگر حسن الصورت. یہی اختلاف اطاعت خداوندی واسترضائے مولیٰ میں ظاہر ہوا. کہ اگر ایک جماعت نے اطاعت خداوندی میں سرگرمی کا اظہار کیا تو دوسری جماعت تمرد اور انحراف میں حد سے متجاوز ہونے لگی حتی کہ ربوبیت کا دعویٰ بھی کیا گیا. اسی لئے فرمایا گیا کہ۔

**ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرٰی کُلَّمَا جَآءَ اُمَّۃً رَّسُوْلُھَا کَذَّبُوْہُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَھُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰھُمْ اَحَادِیْثَ** (المؤمنون : ۴۴)

ترجمہ:۔ پھر (ان کے پاس) ہم نے اپنے پیغمبروں کو یکے بعد دیگرے (ہدایت کے لئے) بھیجا (جس طرح وہ امتیں پیدا ہوا کیں. مگر ان کی حالت یہ ہوئی کہ) جب کبھی کسی امت کے پاس

اس امت کا (خاص) رسول (خدا کے احکام لیکر) آیا انہوں نے اس کو جھٹلایا. سو ہم نے (بھی ہلاک کرنے میں) ایک کے بعد ایک کا نمبر لگادیا. اور ہم نے ان کی کہانیاں بنادیں. (یعنی وہ ایسے نیست ونابود ہوئے کہ بجز کہانیوں کے ان کا کچھ نام ونشان نہ رہا)(بیان القرآن. سورہ مومنون)

**انسان کا پہلا جرم**: قابیل کا پہلا قدم مالک الملک کی معصیت میں اٹھا. اور ذرا سی بات پر اپنے بھائی ہابیل کے خون میں اپنے ہاتھ رنگے۔

اور اولاد کی کثرت کے ساتھ ساتھ معصیت کی کثرت بھی ہوتی گئی. ہزاروں برس تک یہی سلسلہ جاری رہا. ایک جانب ارحم الراحمین کی رحمت گم گشتگان وادیٔ ضلالت کو ہاتھ پکڑ کر نار جہنم میں گرنے سے روکتی تھی. تو دوسری جانب طاغوتی قوتیں اپنے تمام شیاطین اور تمام قوتوں کے ساتھ عتاب خداوندی کے ابدی عذاب میں مبتلا کرنے کی سعی کرتی تھیں۔

**انبیاء علیہم السلام کی مخالفت**: ۔ اسی کشمکش کے ساتھ وہ وقت بھی آگیا تھا کہ حضرت ابن مریم علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے اور یہود کی ناقابل برداشت اذیتیں برداشت کرنے کے بعد آسمان پر اُٹھا لئے گئے. اور حوارین نے کچھ دنوں تک تو حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہنے کی سعی کی. مگر زمانہ کے امتداد. مخالف قوتوں کے تزاحم نے ان کو صراط مستقیم پر نہ رہنے دیا. احکام خداوندی میں تحریف کی عادت ہو ہی گئی تھی. حتیٰ کہ آسمانی کتاب (انجیل) بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکی۔

اگر تھوڑی سی تحریف ہوتی تب بھی انجیل ناقابل عمل ہو جاتی. کیونکہ دستاویز کا ایک لفظ بھی مشکوک ہو تو وہ ناقابل اعتبار ہو جاتی ہے. چہ جائیکہ اس میں تھوڑے سے تغیر و تبدل کا یقین ہو لیکن یہاں تو تغیر و تبدل اس نوبت پر پہنچ چکا تھا کہ اصول شریعت (توحید وغیرہ) جس پر تمام انبیاء کا اتفاق تھا وہ بھی باقی نہ تھا. کیونکہ باپ. بیٹا. روح القدس. اسی میں موجود ہو گئے تھے ایک میں تین اور تین میں ایک. یا اقانیم ثلاثہ کا عقیدہ بھی اسی کتاب میں بتایا جانے لگا تھا پھر جزئیات اور فروعی مسائل کی نسبت تو اعتماد ہی غلط ہے۔

غرض یہ کہ انجیل کی یہ تحریف اپنی کثرت کے ساتھ معنوی بھی تھی اور لفظی بھی نوبت باین جا رسید کہ تھوڑی ہی مدت کے بعد ایک جماعت کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ ابن مریم خود ہی خدا تھے جو فلاں فلاں مصالح حوائج کی بنا پر انسانی جسم کا چولا پہن کر دنیا میں آ گیا تھا. اسی لئے قرآن نے بھی ایک ایک عقیدے کو رد کیا. فرمایا:۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۔ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا

اور (کافر) لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد (بھی) اختیار کر رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم نے (جو) یہ (بات کہی تو) ایسی سخت حرکت کی ہے کہ اس کے سبب کچھ بعید نہیں کہ آسمان پھٹ پڑیں اور زمین کے ٹکڑے ٹکڑے اڑ جائیں اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں اس بات سے کہ وہ لوگ خدا کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں حالانکہ خدا تعالیٰ کی شان نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے۔) (مریم: ۸۸ تا ۹۲) نیز فرمایا:

«لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ» (المائدہ: ۷۲)

(ترجمہ:۔ بے شک وہ لوگ کافر ہو چکے جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ عین مسیح ابن مریم ہے حالانکہ مسیح نے خود فرمایا کہ اے بنی اسرائیل! تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ بے شک جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک قرار دے گا سو اس پر اللہ تعالیٰ جنت کو حرام کر دے گا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔) (المائدۃ: ۷۲)

نیز فرمایا:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا إِلٰهٌ وَاحِدٌ وَإِنْ لَمْ يَنْتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

(بلاشبہ وہ لوگ بھی کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔ حالانکہ بجز ایک معبود کے اور کوئی معبود نہیں۔ اور اگر یہ لوگ اپنے ان اقوال سے باز نہ آئے تو جو لوگ ان میں کافر رہیں گے ان پر دردناک عذاب واقع ہوگا۔) (المائدۃ: ۷۳)

گمراہی:۔ یہ خلط ملط. تغیر تبدل حد سے اس قدر متجاوز ہوا کہ اس دین عیسوی پر جس کو منزل من اللہ کہا جاسکے قائم رہنے والے معدودے چند رہ گئے. اور وہ بھی اس طرح کہ کوئی ملک کے اس گوشے میں اور کوئی شخص زمین کے کسی حصے میں. پھر ان کی شہرت بھی نہ تھی کہ رشد وہدایت کا سلسلہ جاری رہتا اگر کسی کو دو چار آدمیوں نے جان لیا تو جان لیا. مان لیا تو مان لیا. ورنہ بعض بالکل ہی گمنامی کی حالت میں دنیا سے کوچ کرتے اور "قَلَّ تُرَاثُہٗ وَقَلَّتْ بَوَاکِیْہِ" (جس کی میراث کم ہو اور جس پر رونے والیاں کم ہوں) کا سچا مجسمہ ہوتے تھے اس حالت پر صدیاں گزر گئیں. شرک وکفر. طغیان کی کالی کالی گھٹائیں آفاق عالم پر محیط ہو گئیں. ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خدا کے بندوں کو اب خدا کی حاجت ہی نہیں ہے. مگر فطرت الٰہیہ کی قوت. وجود باری کی عظمت عقول سلیمہ کو مجبور کر رہی تھی کہ خلّاق عالم کے وجود کو تسلیم کرے. آج بھی وہ لوگ جو قادر مطلق کے منکر ہیں مگر عالم کے منظم نظام کو دیکھ کر کسی قوت کے ماننے پر مجبور ہو کر کہتے ہیں کہ قدرت نے فلاں کام کیا. قدرت کا فلاں نظام ہے. جس کا معنٰی اس سے زیادہ اور کیا ہے کہ قادر کا انکار اور قدرت کا اقرار ہے. اور عقل تو بجائے خود سمجھدار بچے بھی جانتے ہوں گے کہ اوصاف بغیر موصوفات کے موجود ہو ہی نہیں سکتے ہیں۔

عمرو بن عبسہ سلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:

**رَغِبْتُ عَنْ اٰلِهَةِ قَوْمِیْ فِی الْجَاهِلِیَّةِ (اَیْ تَرَکْتُ عِبَادَتَهَا) قَالَ فَلَقِیْتُ رَجُلًا مِّنْ اَهْلِ الْکِتَابِ مِنْ اَهْلِ تَیْمَاءَ وَهِیَ قَرْیَةٌ بَیْنَ الْمَدِیْنَةِ وَالشَّامِ فَقُلْتُ اِنِّیْ امْرَءٌ مِّمَّنْ یَّعْبُدُ الْحِجَارَةَ فَتَرَی الرَّجُلَ مِنْهُمْ لَیْسَ مَعَهٗ اِلٰهٌ فَیَخْرُجُ فَیَاْتِیْ بِاَرْبَعَةِ اَحْجَارٍ فَیُعَیِّنُ ثَلَاثَةً لِقِدْرِهٖ اَیْ یَسْتَنْجِیْ بِهَا وَ یَجْعَلُ اَحْسَنَهَا اِلٰهًا یَعْبُدُهٗ ثُمَّ لَعَلَّهٗ یَجِدُ مَاهُوَ اَحْسَنَ مِنْهُ شَکْلًا قَبْلَ اَنْ یَرْتَحِلَ فَیَتْرُکُهٗ وَیَاْخُذَ غَیْرَهٗ وَاِذَا انْزَلَ مَنْزِلًا سِوَاهُ وَرَاٰی مَاهُوَا حُسْنَ مِنْهُ تَرَکَهٗ وَاَخَذَ ذَالِکَ الْاَحْسَنَ فَرَاَیْتُ اَنَّهٗ اِلٰهٌ بَاطِلٌ لَا یَضُرُّوَلَا یَنْفَعُ فَدُلَّنِیْ عَلٰی خَیْرٍ مِّنْ هٰذَا**

**(السیرة النبویه لا حمد زینی دحلان بر حاشیه سیرة حلبیه ص ۱۰۹)**

یعنی عمرو بن عبسہ فرماتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں مجھ کو اپنی قوم کی بت پرستی سے نفرت پیدا ہوئی۔ اسی زمانہ میں میں تیماء کے رہنے والے ایک پادری سے ملا. اور اس سے کہا کہ میں اس

مرادیں مانگتے تھے

جو خود محتاج ہووے دوسرے کا بھلا اس سے مدد کا مانگنا کیا

اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ چلتے پھرتے آتے جاتے کسی ایک پتھر کو خوبصورت دیکھ کر اٹھالیا۔ پرستش شروع کر دی اُس سے دل سیر ہو گیا یا اُس سے زیادہ خوبصورت کوئی دوسرا پتھر مل گیا تو اُس کو پھینک کر دوسرے کو تخت خداوندی پر متمکن کر دیا۔ گویا خداوندی تخت بندوں کے ہاتھ میں آگیا۔ جس کو جب تک چاہا خداوندی تخت پر بیٹھنے دیا اور جب چاہا معزول کر دیا۔

نئی قسم کی بت پرستی:۔ ابی رجاء عطاردی فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں بحالت سفر جب ہم کو کسی جگہ عبادت کے لئے پتھر میسر نہ آتا تھا۔ تو ہم تھوڑی بہت مٹی کا ڈھیر لگا لیتے تھے۔ اور بکری کا دودھ اُس پر دوھتے تھے۔ اس کے بعد مٹی کے اُس ڈھیر کا طواف شروع کر دیتے تھے۔

دین حنیف جس کی عظمت کو حضرت ابراہیم علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خانہ کعبہ سے شروع کیا تھا اس زمانہ میں ایسا لاوارث ہو گیا تھا کہ سب سے زیادہ شرک اسی خانۂ معبود میں ہوتا تھا اور بت پرستی کا مرکز تھا۔ پتھر کے خدا اس میں براجمان تھے۔ (البدایہ والنہایہ ص ۱۸۸ ج ۲)

ان کثیر التعداد خداؤں پر بس نہ تھی بلکہ بقول صاحب مغازی ابن اسحٰق کے ہر ہر گھر میں ایک ایک بت تھا۔ جس کی عبادت ہوتی۔ اگر صاحب خانہ سفر کے لئے جاتا تھا۔ تو گھر سے نکلتے وقت اس کی ڈنڈوت کرتا تھا اور واپس ہوتا تھا تو سب سے پہلے اسی بت کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی (البدایہ ص ۱۹۱ ج ۲) تعدد آلہہ کا عقیدہ قلب میں اس طرح جاگزیں ہو گیا تھا کہ اس کو شمس فی نصف النہار سے بھی زیادہ اقویٰ اور اجلیٰ سمجھ بیٹھے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کا اعلان فرمایا متعجب ہو کر کہتے تھے۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهاً وَّاحِداً اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ

ترجمہ:۔ کیا اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا واقعی یہ بہت عجیب بات ہے۔ (ص: ۵)

فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک مرتبہ زمانۂ جاہلیت کی عقل سے گئی گزری ہوئی باتوں اور

جماعت کا ایک فرد ہوں جو بت پرستی کیا کرتے ہیں. اگر ان میں سے اتفاق سے کوئی ایسا شخص سفر کو نکل کھڑا ہوا جس کے ساتھ اسکا معبود نہیں ہے تو وہ منزل پر پہنچ کر استنجا کے لئے پتھر کے چار ٹکڑے لاتا تھا. ان میں سے جو خوبصورت ہوتا تھا اُس کو خدا فرض کر کے عبادت شروع کر دیتا اور پوری عظمت کے ساتھ رکھتا تھا. اور اگر اسی سفر میں اس کو چلتے پھرتے اور پتھر اس سے بھی اچھا گرا پڑا مل گیا تو اس پہلے کو پھینک کر اس دوسرے کو معبود بنا کر پرستش کرنے لگتا تھا. تمام سفر میں یہی طریقہ رہتا تھا. اس سے میں نے تو یہی سمجھا کہ نہ یہ معبود برحق ہے نہ اس کی عبادت. عبادت صحیحہ اھ

اور چونکہ وجود باری کا انکار آفتاب نصف النہار کا انکار تھا. عقل اس کا انکار نہ کر سکتی تھی. مگر صحیح راستے پر لے چلنے والا کوئی نہ تھا اس لئے ہر شخص آزادی کے ساتھ جس کو چاہتا تھا اپنا معبود بنا لیتا تھا اور اس کے سامنے سر جھکاتا تھا۔

حتیٰ کہ رعایا بادشاہوں کو اپنا رزاق. مالک. معبود سمجھتی تھی اور ان کے خود مختارانہ احکام کو قادر مطلق کے فرامین سمجھتی تھی. یہ پرستش بھی گمراہی اور حماقت میں کچھ کم نہ تھی مگر سلاطین کے یہ پرستار فی الجملہ معذور بھی تھے کیونکہ یہ تو دیکھتے تھے کہ یہ خود مختار حکمران جو کچھ چاہتے ہیں وہ ہو کر رہتا ہے. جو حکم دیتے ہیں اس سے سرتابی کا امکان نہیں. بہت سے بہت قصور نظر کی وجہ تیر کو کمان سے نکلتا ہوا دیکھ کر سمجھتے تھے کہ تیر کو کمان پھینک رہی ہے. حالانکہ تیر کا چلانے والا کمان دار تھا۔

گرچہ تیر از کمان ہمی گزرد　　از کماں دار بیند اہل خرد

یہ نہ سمجھتے تھے کہ اس برائے نام خود مختاری کے باوجود ان گنت امور میں یہ سلاطین ہماری طرح محتاج ہیں. اور احتیاج و خدائیت دو متضاد وصف ہیں. اگر آب و آتش کا یکجائی اجتماع ناممکن ہے تو خدائیت و احتیاج کا اجتماع ایک ذات میں اس سے زیادہ مستبعد ہے۔

تاہم یہ لوگ اُن سے کم درجہ میں تھے جو اینٹوں. پتھروں بلکہ درختوں اور جانوروں کے ساتھ وہ معاملہ کرتے تھے جو ایک عابد. معبود کے ساتھ کرتا ہے۔

کیا یہ عقل کی وارفتگی نہیں ہے کہ جس پتھر کی اپنی آنکھوں سے سینکڑوں دفعہ پائمالی دیکھ چکے تھے اُنہیں کو اونچی جگہ پر رکھ کر سجدے کرتے تھے. قاضی حاجات. دافع بلیات سمجھتے تھے.

رسموں کاذکر تھا. اور قریب قریب سب ہی یک زبان تھے کہ عجب قسم کی حماقت رائج تھی کہ ایسی چیزوں کو معبود بنالیا جاتا تھا جن سے نہ نفع ہو نہ ضرر. اسی اثناء میں ایک جلیل القدر. عظیم المرتبت صحابی نے کہا کہ آپ لوگوں کو ان خود تراشیدہ اور ہاتھوں کے بنائے معبودوں نے نفع نہ دیا ہو تو نہ دیا ہو. مگر مجھ کو تو نفع اس سے پہنچا ہے فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر تو اس جرأت اور صاف گوئی کا اثر نہ ہوا. وہ ذات ایک کوہ وقار تھی معمولی تحریک سے کب متحرک ہو سکتی تھی. آپ عظیم الشان سمندر تھے کہ اُس میں ہاتھوں کی حرکت سے طغیانی نہ ہو سکتی تھی. جس طرح اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی باتیں سن رہے تھے اُن کی بھی سن لی. مگر مجلس میں سناٹا چھا گیا حضور کی مجلس میں کہ جس کو۔

مَجْلِسَ عِلْمٍ وَحَيَاءٍ وَصَبْرٍ وَاَمَانَةٍ لَا تُرْفَعُ فِيْهِ الْاَصْوَاتُ وَلَا تُؤْبَنُ فِيْهِ الْحُرَمُ

ترجمہ:۔ آپ کی مجلس میں علوم کا تذکرہ ہوتا تھا، اہل مجلس حیا اور صبر کے ساتھ رہتے تھے. اس میں امانتداری کا پاس کیا جاتا تھا. اہل مجلس بلند آواز سے نہ بولتے تھے. نہ اس میں آبروریزی کی جاتی تھی۔

کا مصداق بتایا گیا ہے غلط اور بظاہر۔

اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ (الانبياء: ٦٦)

ترجمہ:۔ خدا کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پرستش کرنے لگے ہو جو قطعاً نفع نہ دیں نہ نقصان پہنچاویں۔

کے خلاف بات. اور وہ بھی بتوں کی تعریف. بعض حضرات نے خوف سے سر جھکالیا کہ مبادا ان کی مذمت آسمان سے نازل ہو. بعض نے ان کے چہرے کو حیرت کے ساتھ تکنا شروع کر دیا. بعض کی نظریں بتاتی تھیں کہ اُن کو اِن کے اسلام ہی میں شک ہو گیا ہے. بعض ایسے بھی تھے کہ نہ تو اُن کو ان کے اسلام میں شک تھا. اور نہ ان کے قول کو صادق سمجھتے تھے. انہوں نے مجلس کی مہر سکوت کو توڑا اور دریافت کیا کہ بت نے نفع پہنچایا؟ یہ کیونکر. انہوں نے پوری متانت کے ساتھ جواب دیا کہ میں نے یہ معبود اپنے ہاتھ سے بنایا اور گڑ سے بنایا تھا. وہ از سر تا پا گڑ تھا. اور میں مدتوں سے اُس کی عبادت کیا کرتا تھا. ایک مرتبہ حسب عادت قافلے کے ساتھ سفر میں گیا.

قافلہ ایک لق و دق میدان میں فروکش ہوا. اتفاق سے وہاں کسی کو کچھ بھی کھانے کے لئے نہ ملا. رفقائے سفر حیران تھے کہ کیاں کریں. میں نے بھی جستجو کی. اور جب یقین ہو گیا کہ یہاں کچھ نہ ملے گا. اور حد اضطرار تک پہنچ جانے والی بھوک کے ساتھ یہاں سے سفر کرنا ہو گا تو میں نے اُس کو باطمینان تام کھالیا. اور اس قدر کھایا کہ میرا پیٹ بھر گیا. تم ہی بتاؤ کہ اگر میں اُس بت کو بغرض عبادت سفر میں ساتھ نہ رکھتا تو فاقہ کرنا پڑتا یا نہیں؟

حضور کی مجلس متانت و وقار کی مجلس ہوتی تھی. وہاں قہقہوں کی آواز "چیل کے گھونسلے میں ماس" سے کم نہ تھی. خود حضور نے بھی عمر بھر قہقہہ نہیں کیا. عموماً تبسم فرمایا کرتے تھے. چند ہی مواقع ایسے ہیں کہ ان میں اس قدر ہنسی آئی کہ دندان مبارک ظاہر ہو گئے. ایسی مجلس میں ناممکن تھا کہ قہقہے لگائے جاتے. مگر یہ سن کر سب کو بے ساختہ ہنسی آ گئی. اور خود حضور نے بھی تبسم فرمایا۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ عقل کی بے بسی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ بت مٹھائیوں کے بھی بنتے تھے. عجیب تر یہ کہ خود خانۂ کعبہ میں غیر محدود بت موجود تھے جن کی باضابطہ پرستش ہوتی تھی. مادر زاد ہو کر طواف کیا جاتا تھا اور بسا اوقات عورتوں اور مردوں کا یہ مخلوط مجمع اس عریاں طواف کی خدمات انجام دیا کرتا تھا۔

عزیزے کہ ہر کز درش سر بتافت      بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

**اہلِ فترت اور ان کی قسمیں:** ۔ اس زمانے کے لوگوں کو اہل فترت کہا جاتا تھا. ان کے حالات و اطوار کی بنا پر ان کی تین قسمیں قرار دی گئی تھیں۔

پہلی قسم میں ایک جماعت اُن لوگوں کی تھی جو اگرچہ انبیاء و رسل کی صحبت. زیارت سے تو محروم تھے ہی. روایات صحیحہ سے بھی ان مبارک ہستیوں اور مقبولان بارگاہ خداوندی کے اقوال و افعال ان کو معلوم نہ ہو سکے تھے. ہاں نظام عالم کے مشاہدات لیل و نہار کے انقلابات صیف و شتا موت و حیات کا الٹ پھیر. شمس و قمر کی گردشیں ان کی نظروں سے اوجھل نہ تھیں. اور ان کے لئے ان سے آنکھیں بند کرنا آسان نہ تھا. اور اسی لئے ان کو یقین تھا کہ عالم اور اس کے تکوّنات و تغیّرات خود رو نہیں ہیں. جب کہ دنیا کا کوئی ذرہ بھی بغیر تحریک کے متحرک نہیں ہے تو یہ

عالَم اس نظمِ خاص سے کہ ہر ہر چیز اپنے وقت مقرر پر ہوتی ہے. کسی حقیقی موجد اور صاحب قدرت اور فاعل مختار کے بغیر کیونکر چل سکتا ہے۔

یہ لوگ نہ صرف یہ کہ خالق عالم کے وجود کو پہچانتے تھے. بلکہ اُس کی وحدت کے بھی قائل تھے. اور اسی لئے عقل کی روشنی میں بت پرستی کو بدتر جانتے تھے. چنانچہ انہیں میں بعض ایسے بھی تھے کہ ان کی گردن کسی بت کے سامنے کبھی بھی نہ جھکی تھی. بعض نے آباؤاجداد کی اندھی تقلید کی رہنمائی میں کچھ دنوں جبہ سائی کی مگر نور بصیرت نے جلد ہی بتادیا کہ راستہ غلط ہے کسی نے

أَرَبًّا وَّاحِدًا أَمْ أَلْفَ رَبٍّ ۔۔۔ أَدِيْنُ إِذَا انْقَسَمَتِ الْأُمُوْرُ

تَرَكْتُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى جَمِيْعًا ۔۔۔ كَذٰلِكَ يَفْعَلُ الرَّجُلُ الْبَصِيْرُ

ترجمہ:۔ جب کام تقسیم ہوتے ہیں تو میں ایک رب کو مانوں یا ہزار رب کو۔ میں نے لات اور عزیٰ تمام بتوں کو چھوڑ دیا اسی طرح صاحب بصیرت شخص کرتا ہے۔

کہا. اور کسی نے یہ دیکھ کر کہ پتھر کے یہ بے حس و حرکت مجسمے یہ بھی نہیں کر سکتے کہ جنگل کی لومڑیاں ان پر پیشاب کر دیتی ہیں اور یہ معبودانِ مسجود نہ پیشاب سے بچنے کی ہمت کر سکتے ہیں نہ پیشاب کرنے والیوں سے۔

أَرَبٌّ يَبُوْلُ الثَّعْلَبَانُ بِرَأْسِهٖ "کیا یہ بھی کوئی قابل پرستش معبود ہے جس کے سر پر لومڑیاں پیشاب کر دیتی ہیں"۔

کہہ دیا، اور اس آبائی رسم کو ترک کر دیا۔

خداوند عالم فرماتا ہے:

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ

ترجمہ:۔ اے لوگو. ایک عجیب بات بیان کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سنو (وہ یہ ہے کہ) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن کی تم لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ ایک ادنیٰ مکھی کو تو پیدا کر ہی نہیں سکتے گو سب کے سب بھی (کیوں نہ) جمع ہو جائیں اور (پیدا کرنا تو بڑی بات ہے وہ ایسے عاجز ہیں کہ) اگر ان سے مکھی کچھ چھین لے جائے تو اس کو (تو) اس سے چھڑا (ہی) نہیں

سکتے۔ (الحج:۷۳)

اس قسم کے لوگ وجود باری بلکہ خالق عالم کی توحید کے بھی قائل تھے. مگر تفاوت عقول کی وجہ سے ان کے مسلک بھی مختلف تھے. بعض نے آبائی رسوم کو جو کہ خارج از عقل تھیں ترک کر دیا لیکن نہ یہود کا طریقہ اختیار کیا نہ نصرانیت میں داخل ہوئے۔

**نبی آخرالزمان کی بشارت:** ۔ ایاد نامی خاندان کے ایک فرد "قس بن ساعدہ" کا شمار اسی قسم کے لوگوں میں ہے. یہ شخص اسی زمانہ جاہلیت میں نہ صرف یہ کہ وجود باری اور توحید کا قائل تھا بلکہ ازمنہ سابقہ کے حالات. اور کارکنان قضاوقدر کے طرز عمل کو دیکھ کر وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ مخلوق کے اس طرح شتر بے مہار ہو کر آزاد رہنے کو رحمت خداوندی دیر تک برداشت نہیں کر سکتی ہے. اور چونکہ خانۂ کعبہ کی برکات سے بھی ناواقف نہ تھا. احبار اور رُہبان کے اقوال سے بھی بے خبر نہ تھا اس لئے یہ بھی سمجھتا تھا کہ عنقریب انہیں اطراف میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور مبعوث ہو گا. حتیٰ کہ ایک مرتبہ تو اس نے مجمع عام میں علی الاعلان خانۂ کعبہ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "سَیُعْلَمُ حَقٌّ مِنْ ہٰذَا الْوَجْہِ" (یعنی عنقریب یہاں سے حق ظاہر ہو گا) مجمع میں سے کسی نے کہا کہ کیا مطلب ہے؟ تو اُس نے کہا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ لؤی بن غالب کے خاندان کا کوئی شخص تم کو کلمۂ اخلاص کی دعوت دے گا. حیات ابدی. اور دائمی نعمتوں کی طرف بلاوے گا. میں تم سے خیر خواہانہ طرز پر کہتا ہوں کہ جب کبھی ایسا ہو تو تم لوگ اس کی بات مان لینا. اگر مجھ کو اپنی زندگی پر بھروسہ ہوتا اور یقین ہوتا کہ میں وقت مذکور تک زندہ رہوں گا تو تم میں سب سے پہلے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور تابعداری کرتا۔ (سیرت نبویہ)

**حضرت زید بن عمرو بن نُفیل:** ۔ اسی جماعت میں زید بن عمرو بن نفیل بھی تھے. سعید بن زید کے والد ہیں جو کہ عشرہ مبشرہ بالجنہ میں سے ہیں اور حضرت فاروق اعظم کے چچا ہیں۔ زید بھی اپنی عقل سلیم کی رہبری میں توحید کے قائل. بت پرستی کے تارک. اور تمام مشرکانہ رسوم سے الگ تھلگ رہنے والے تھے. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل دنیا سے اٹھ گئے تھے اپنے زمانہ حیات میں بارہا مجامعِ عامہ میں کہا ہے کہ۔

**انی خالفت قومی و اتبعت ملة ابراھیم و اسمٰعیل وما کانا یعبدان، وکانا یصلیان الی ھذہ القبلة وانا انتظر نبیا من بنی اسمٰعیل ولا ارانی ادرکہ وانا او من بہ و اصدقہ واشھد انہ نبی**

ترجمہ:۔ میں نے اپنی قوم کی مخالفت کی، اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کی ملت کو اختیار کیا، اور یہ دونوں جس خدا کی عبادت کرتے تھے اسی کی عبادت میں بھی کرتا ہوں، یہ دونوں اسی قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، اور میں اس نبی کا منتظر ہوں جو حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے ہو کر مبعوث ہو گا مجھ کو توقع نہیں کہ میں ان سے مل سکوں گا مگر میں ان پر ایمان لاتا ہوں اور ان کو سچا نبی سمجھتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ وہ نبی ہیں۔

عامر بن ربیعہ سے تو انہوں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر تم اس وقت تک زندہ رہو کہ وہ نبی مبعوث ہوں جن کی بعثت کا مجھ کو یقین ہے تو تم ان کی خدمت میں میرا اسلام ضرور عرض کر دینا، چنانچہ عامر نے آپ کی خدمت میں ان کا سلام پہنچایا، آپ نے جواب دیکر دعائے رحمت کی، اور یہ بھی فرمایا کہ میں نے ان کو جنت میں دامن کشاں کشاں پھرتے ہوئے دیکھا ہے۔

اس موقع پر یہ شبہ رفع کر دینا ضروری ہے کہ زید نے اِتَّبَعْتُ مِلَّةَ اِبْرَاہِیْمَ کہہ کر اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا متبع قرار دیا تھا پھر ان کو اہل فترت کی اس جماعت میں ہم نے کیوں داخل کیا، کیونکہ اس قسم میں تو صرف وہی لوگ داخل ہو سکتے ہیں جو اپنی عقل سے صراط مستقیم کو منتخب کر چکے ہوں، کسی آسمانی ملت کے متبع نہ ہوں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ملت ابراہیمی کو اس درجہ متغیر کر دیا گیا تھا کہ اس میں بعض قطعیات کے علاوہ کوئی دوسرا نشان بھی باقی نہ تھا پس اس کو ملت ابراہیمی کہنا ہی صحیح نہ تھا۔

**صدّیقِ اکبر:۔** اسی جماعت میں افضل الناس بعد الانبیاء ابو بکر صدیق بھی تھے، انہوں نے از ابتدائے طفولیت تا وقت وفات کبھی بھی کسی بت کے سامنے سر نہیں جھکایا نہ سجدہ کیا، بلکہ یہ بھی غلط نہیں کہ مشرکانہ رسوم میں سے کسی ایک رسم کو بھی نہیں کیا، اور اسی لئے بعض اہل تحقیق فرماتے ہیں کہ ابو بکر اور علی بن ابی طالب دونوں مرتبہ صدیقیت سے فائز اور لقبِ صدیق سے ملقب ہیں، کیونکہ ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی از مہد تا لحد کسی بت کے سامنے سر نہیں

جھکایا تھا۔ یہ اتفاقی بات ہے کہ دونوں میں مابہ الامتیاز قائم کرنے کے لئے ایک کو صدیق اور دوسرے کو کَرَّمَ اللہُ وَجْہَہٗ کے ساتھ یاد کیا جاتا رہا ہے۔ (سیرۃ نبویہ)

**ان کی دوسری قسم:۔** ان کی دوسری جماعت وہ تھی۔ جس نے اپنے آپ کو شرک کی نجاست سے بچایا۔ اور اسی پر بس نہ کی بلکہ ایسے سماوی دین میں بھی داخل ہوگئے جس کے آثار و احکام نسبتاً زیادہ باقی تھے۔

اس جماعت میں تُبَّعْ اور اس کی قوم حمیر نامی۔ اہل نجران۔ ورقہ بن نوفل داخل ہیں۔ یہ تمام جماعتیں دین عیسوی کے منسوخ ہونے سے قبل زمانۂ جاہلیت ہی میں نصرانیت قبول کر چکے تھے۔

**رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کا اسلام:۔** اسی سلسلے میں یہ بحث آجاتی ہے کہ فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کس جماعت میں تھے؟

علمائے محققین نقد و تبصرے کے وقت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ۔ اجماع امت کو پیش نظر رکھ کر کسی مبحث پر حکم دیتے ہیں۔ اس مرحلے پر ان کے یہاں محبت۔ عظمت کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک عالم کو اپنے لاڈلے۔ بیٹے سے کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو۔ اس کی ذرا سی بے چینی۔ دن کی غذا۔ رات کی نیند حرام کر دیتی ہو مگر جب ترکِ صلوٰۃ کا مسئلہ پیش آوے گا تو وہ مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّداً فَقَدْ کَفَرَ (یعنی جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی تو تحقیق اس نے کفر کیا) کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرے گا۔

علماء کا یہ طریقہ اپنے علم سے سیکھا ہوا ہے۔ ان کے اسلاف نے ان کو یہی بتایا ہے کہ حق گوئی کے موقع پر لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَائِمٍ (یعنی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اندیشہ نہیں کرتے) پر عمل کریں۔

اس سلسلے کی مناسبت سے وہ واقعہ بیان کیا جا سکتا ہے جو زبان زد ہے کہ ایک کبیرہ کے جرم میں حضرت فاروق اعظم نے اپنے بیٹے کو کوڑے مارے جانے کی سزا دی۔ اور صاحبزادہ مذکور اس اقامت حد کے دوران میں شہید ہو گئے۔ کیونکہ اس واقعہ سے وہ محبت بھی ثابت ہے جو کہ حضرت

فاروق اعظم کو اپنے صاحبزادے سے تھی، اور وہ ثبات واستقلال بھی ثابت ہے جو عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ (اس کو خوب مضبوطی سے پکڑو۔) پر عمل کرتے ہوئے حدود شرعیہ پر تھا۔

اس واقعہ کی صداقت مشتبہ ہے، علمائے محققین کی آراء میں اس کے سقم اور صحت میں اختلاف ہے بعض حضرات اگر دبی زبان سے اس کی تصدیق کرتے ہیں تو اکثر حضرات اس کو صاف لفظوں میں موضوع (خود ساختہ) کہہ دینے میں بھی تامل نہیں کرتے ہیں۔
مختلف فیہ واقعہ کو بیان کرنا عبث ہے۔ ہم اس موقع پر ایک دوسرا واقعہ بیان کرتے ہیں جس سے اسلامی فرق مراتب واضح ہو جاوے۔

**اسلام میں فرق مراتب:۔** عمران اور حصین، دونوں صحابی ہیں، اول الذکر بیٹے ہیں اور باپ سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے مؤخر الذکر باپ ہیں اور بیٹے کے مسلمان ہو جانے کے بعد مسلمان ہوئے ہیں۔

عمران تو فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو چکے تھے، ان کا اکثر وقت آپ ہی کی خدمت میں گزرتا تھا، لیکن حصین اب تک شرف اسلام سے مشرف نہ ہوئے تھے۔
کفار قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ناراض نہ تھے، بلکہ آپ کے فضائل کے معترف اور خصائل حسنہ کے مقر تھے، اوران کی معقول تعداد ایسی بھی تھی جو آپ کے امتثال امر کو ضروری سمجھتی تھی آپ کو مستجاب الدعوات مانتی تھی، مگر ان سب کے لئے یہ امر ناقابل برداشت تھا کہ آپ کی تقریر میں ایسے کلمات بھی ہوتے تھے جن کی وجہ سے ان کے آلہہ باطلہ کی سابقہ عظمت مزعومہ باقی نہ رہتی تھی، یہ جرم ان کے نزدیک ناقابل عفو جرم تھا، قتل و قتال کے ذریعہ سے خون کی ندی بہادینی ان کے نزدیک دشوار تھی مگر یہ کلمات ان کے لئے کوہ گراں سے بھی زیادہ ثقیل تھے۔

حصین رؤسائے قریش میں سے تھے، کفار کے ایک بڑے مجمع نے ان سے ان خود ساختہ معبودوں کی توہین کی شکایت کی، اور کہا کہ اس شخص (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے فتنہ برپا کر رکھا ہے آج تک ہم نے اس کی خاندانی عظمت کا خیال کیا اور سچ تو یہ ہے کہ خود اس میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں مگر یہ شخص ہمارے دیوتاؤں کی توہین کرتا ہے، ہم اس کی پاداش میں بآسانی

موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے مگر اس کی خاندانی عظمت اور ذاتی خوبیوں نے ہم کو اس سے روک رکھا ہے۔ اور ہم نے اس کو اس توہین کی سزا آج تک نہیں دی، ہم نے بہت سمجھایا کہ یہ شخص جو چاہے کرے مگر ہمارے دیوتاؤں کی توہین نہ کرے مگر ہمارے سمجھانے سے یہ شخص سمجھتا نہیں ہے، اگر آپ ہی اس کو سمجھا دیں تو اچھا ہو، آپ قوم کے بڑے ہیں، آپ کی بات کا اس پر اثر ہو گا، اگر اس نے آپ کی بات مان لی تو فتنہ کی یہ بھڑکتی ہوئی آگ فرو ہو جاوے گی، اور مکے سے ایک بڑا فتنہ ختم ہو جاوے گا۔

حصین نے خیال کیا کہ موقع اچھا ہے، مجھ کو چاہئے کہ میں ان کو اس غلط طریقہ سے روک دوں اگر انہوں نے میری بات مان لی تو میری سیادت میں چار چاند لگ جاویں گے، اور اگر نہ مانی تب بھی قوم کو یہ باور کرا دینا آسان ہو گا کہ میں ان کے درد و غم میں شریک ہوتا ہوں، اس خیال کے آتے ہی سب کو ساتھ لیکر خدمت میں حاضر ہونے کے لئے طیار ہو گئے، راہ میں خیال آیا کہ اگر ان سب کو ساتھ لیکر خدمت میں حاضر ہوا تو غیر جانبدارانہ انداز نہ رہے گا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خود یقین کر لیں گے یا کوئی ان کو یہ خیال دلا دے گا کہ قوم ان کو لے کر آئی ہے، اور میں ان کا حامی بن کر آیا ہوں، اس صورت میں میری بات کا اثر کم ہو جاوے گا، چنانچہ اسی خیال کی بنا پر حصین نے اپنے ہمراہیوں کو باہر روک دیا، اور تن تنہا حاضر خدمت ہوئے۔

آپ نے ان کو آتا ہوا دیکھ کر فرمایا کہ یہ شخص اگرچہ کافر ہے مگر اپنی قوم کا سردار ہے، اس کے لئے جگہ چھوڑ دو، صحابہ سمٹ کر بیٹھ گئے اور ایک شخص کے بیٹھنے کی جگہ نکل آئی، عمران اپنی جگہ پر رہے، ان کو ضرورت نہ تھی کہ جگہ دیں کیونکہ جگہ ہو چکی تھی، جس طرح اس سے پہلے بیٹھے تھے اب بھی بیٹھے رہے حصین آکر حضورؐ کے قریب بیٹھ گئے اور جس طرح ہوشیار لوگوں کا طریقہ ہوتا ہے کہ کام نکالنے کے لئے اولاً تعریف شروع کرتے ہیں انہوں نے بھی آپ کی تعریف شروع کر دی، آپ کے خاندان کی مدح کی، پھر کہا کہ نہ معلوم آپ کے مخالفوں نے یہ خبریں کیوں مشہور کر دی ہیں کہ آپ ان معبودوں کی توہین کرتے ہیں جن کو اہل عرب از منہ قدیمہ سے سے مانتے اور اُن کی عبادت کرتے ہوئے آرہے ہیں، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ آپ کی طرف سے یہ باتیں احمق لوگوں نے یا آپ کے دشمنوں نے اڑائی ہیں تاکہ آپ کی اور آپکے خاندان کی دونوں کی عظمت قلوب سے نکل جاوے میں تو آپ سے واقف ہوں، آپ نے کبھی نہ چاہا کہ مکے میں فتنہ

پھیلے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب کچھ نہ دیا مگر نہایت نرمی سے یہ دریافت کیا حصین! تم کتنے معبودوں کی عبادت کرتے ہو، حصین نے کہا کہ غلط گوئی کرنے والوں نے اس میں جھوٹ کی آمیزش کر رکھی ہے اور چاہتے ہیں کہ ہم کو احمق ثابت کریں۔ اسی لئے انہوں نے مشہور کر دیا ہے کہ ہم ان گنت معبود مانے ہوئے ہیں، اور سینکڑوں دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ خبر غلط اور بالکل غلط ہے ہمارے معبود صرف سات زمین پر ہیں اور ایک آسمان پر، آپ نے اس جملے کی بھی نہ تردید کی نہ تصحیح، پھر نرمی سے فرمایا کہ جب تم پر ارضی یا سماوی کوئی مصیبت پڑتی ہے تو اس وقت کس سے استغاثہ کرتے ہو، حصین نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اچھا ہوا کہ آپ نے یہ بھی دریافت کر لیا، جواب دینے کی وجہ سے بات تو واضح ہو جاوے گی، ابہام تو نہ رہے گا ورنہ میری بات ناتمام تھی، زمینوں کے ان سات خداؤں کی عبادت بھی برائے نام ہوتی ہے، کیونکہ حوادث و مصائب کے نزول کے وقت ہم لوگ صرف آسمانی خدا کو یاد کرتے ہیں، اس یاد میں زمینوں کے خدا شریک نہیں کئے جاتے ہیں۔

آپ نے اس جواب پر ارخائے عنان کیا، اور فرمایا کہ اچھا، اگر کسی وقت تم لوگوں پر مال کی تباہی نازل ہو تو اپنی مصیبت بھری داستانیں کس کو سناتے ہو؟ حصین نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف آسمانی خدا کو، آپ نے سن کر فرمایا کہ حصین! کس قدر بڑے ظلم کی بات ہے کہ تمہاری مصیبتوں کو تو آسمانی خدا دور کرے، جانی اور مالی مصائب کی داستانیں اس کو سناؤ، لیکن جب ان سے نجات مل جاوے، اور عیش و خوشی آوے تو تم اُس کے ساتھ اور معبودوں کو بھی شریک کر لو، کیا اس کے احسانات کا بدلا یہی ہو سکتا ہے؟ کیا اس کی مہربانیوں کی مکافات یوں ہی ہو سکتی ہے، حصین! ان گمراہیوں کو ترک کرو، میری بات مانو، مسلمان ہو جاؤ، حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ نبوت کے متعلق کسی نے کہا تھا کہ

خدا کی دَین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال۔ کہ آگ لینے کو جاویں پیغمبری مل جائے

خدا کا یہ صاحب عزم رسول آگ لانے کے لئے گیا تھا، اس سے حرارت حاصل کر کے سردی کی تکلیف سے اپنے آپ کو، اور بی بی کو بچانے کا ارادہ تھا، گویا تھوڑے سے مبالغے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آگ میں جلنے ہی کے ارادے سے گئے تھے، اور یہی ہوا کہ اُس میں جلے،

اس سے متاثر ہوئے، اور اس تاثر نے یہاں تک قلب کو پھو نکا کہ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ (اے میرے پرور دگار اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں) (الاعراف. ۱۴۳) زبان سے نکلا، مگر حصین کا حال اس سے زیادہ تعجب خیز ہے کیونکہ وہ تو اس کو فتنے کی بھڑکتی ہوئی آگ سمجھ کر اُس کو بجھانے گئے تھے، مقصد یہ تھا کہ اُس سے خود بچیں، دوسروں کو بچاویں، اور خود اُسی میں جل گئے تو گویا آگ بجھانے گئے اور اُسی میں جاکر جلے۔

آپ کے مبارک کلمات نے حصین کے قلب پر اثر کیا اور فوراً مسلمان ہو گئے حصین کے مسلمان ہوتے ہی عمران والہانہ انداز سے اپنی جگہ سے اٹھے، باپ کے قدموں پر گرے، ہاتھ چومے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ یہ حصین وہی حصین ہیں جواب سے تھوڑی دیر پہلے میرے پاس آئے اور بیٹے نے پرواہ بھی نہ کی گویا ان میں باہم کوئی تعلق ہی نہ تھا، لیکن جب کفر کا زنگ اُن سے دور ہو گیا تو عمران نے وہی کیا جو ایک سعادت مند بیٹے کو اپنے باپ کے ساتھ کرنا چاہئے تھا۔ (سیرۃ نبویہ ۱۹۱ ج ۱)

کتابوں کی ورق گردانی کے بعد ایسے واقعات بکثرت ملیں گے، اُن سب کا استیعاب مقصود نہیں ہے نمونے کے طور پر ایک واقعہ اس غرض سے پیش کرنا تھا کہ معلوم ہو جاوے کہ اسلام خبیث کو خبیث اور طیب کو طیب قرار دیتا ہے، اس مرحلے پر اُس کے یہاں کوئی چیز رکاوٹ ڈالنے والی نہیں ہے، مسلمان حق گو، اور صاف گو ہوتا ہے، اور

كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ

ترجمہ:۔ انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو اگرچہ اپنی ذات ہی پر ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو۔ (النساء. ۱۳۵)
اس کے پیش نظر رہتا ہے۔

ہمارے علماء کرام بھی اسی روش پر چلتے ہیں، ان کی فطری محبت، ان کے باہمی تعلقات، احکام شرعیہ کی چھان بین، اور احقاقِ حق میں مانع نہیں ہوتے ہیں۔

اور اسی وجہ سے وہ اس بارے میں مختلف القول ہیں کہ فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کا اسلام و ایمان حسب قواعد شرعیہ ثابت ہے یا نہیں؟

علماء محققین کی ایک معتد بہا جماعت کی رائے ہے کہ شرعی قواعد اور اسلامی ضوابط سے ان کا اسلام ثابت نہیں ہے، یہ حضرات ان تمام دلائل کو رد کرتے ہیں جو ان کے مسلمان ہونے اور ناجی ہونے پر قائم کئے جاتے ہیں۔

انہیں علماء کی دوسری جماعت ہے جو اس امر کی مدعی ہے کہ ان کا اسلام ثابت ہے، اور کہتی ہے کہ ہمارے پاس ایسے ایسے دلائل قویہ ہیں جن کا انکار کوئی منصف مزاج نہیں کر سکتا ہے، اسی لئے امام زرقانی فرماتے ہیں کہ:

**وَلَا بِدْعَ اَنْ يَّكُوْنَ الْاَبَوَانِ الشَّرِيْفَانِ كَالْقِسْمِ الْاَوَّلِ اَعْنِيْ زَيْدَ بْنِ عَمْرِو بْنِ نُفَيْلٍ وَّ قُسَّ بْنِ سَاعِدَةِ، بَلِ الْاَبَوَانِ اَوْلٰى بِذٰلِكَ**

ترجمہ:۔ یہ امر قابل تعجب نہیں کہ آپ کے والدین کو بھی جاہلیت کی قسم اول میں شامل کر لیا جاوے جیسے کہ زید بن عمرو بن نفیل، اور قس بن ساعدہ، بلکہ آپ کے والدین تو بدرجہ اولیٰ اس کے مستحق ہیں کہ قسم اول مذکور میں اُن کو محسوب کیا جاوے۔

مسئلہ پیچیدہ ہے، فریقین میں علمائے اذکیا ہیں، نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلے میں کون سی جماعت غلطی پر ہے، اور اس بارے میں کسی غلط عقیدے پر قائم ہو جانا خطرناک غلطی ہے، جس کی اصلاح ناممکن ہے، ملا علی قاری رحمہ اللہ مذہب حنفیہ کے اچھے خاصے حامی ہیں، مگر چونکہ وہ آپ کے والدین کے کفر کے قائل ہیں، اس لئے شافعیہ کی ایک بڑی جماعت اُن پر برس پڑی ہے، اُن کی عبارتوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا دل اب بھی ٹھنڈا نہیں ہوا، آپ کے والدین ناری ہوں یا ناجی مگر ملا علی قاری کو ناری ہی قرار دیں۔

ہمارے اکابر رحمہم اللہ کا طریقہ اس بارے میں محتاط طریقہ ہے کہ فریقین میں سے کسی ایک کی نہ تائید کرتے ہیں نہ تردید، سکوت اور توقف اختیار فرماتے ہیں۔ یہ طریقہ اس لئے احوط ہے کہ آپ کے والدین کے کفر یا اسلام پر کسی شرعی اصل و فرع کا، یا ایمان و اعمال کا مدار نہیں ہے، غلطی کا احتمال دونوں جانب ہے، اس لئے اس کو علام الغیوب ہی پر مفوض کر دیا جاوے۔

اگر یہ دونوں فی الواقع یعنی عند اللہ مومن ہیں اور ہم نے ان کو کافر کہا تو مَنْ قَالَ يَا كَافِرُ فَقَدْ بَآءَ بِهٖ اَحَدُهُمَا۔ (یعنی جس نے اپنے بھائی کو اے کافر کہا تو یہ کفران دونوں میں سے کسی ایک کی طرف

لوٹتا ہے۔ ) کی وعید کے مصداق ہوئے، اور اگر معاملہ بر عکس ہے تو کافر کو مومن کہہ کر عَدُوُّ اللہِ کو حَبِیْبُ اللہِ ٹھہرایا، یہ بھی قابلِ مواخذہ اور وہ بھی لائق باز پرس، اور سکوت کی صورت میں کوئی خطرہ ہی نہیں ہے، کیونکہ ان کے مسلمان ہونے یا کافر ہونے کا عقیدہ جزو ایمان نہیں ہے۔

**اہلِ فَتْرَت کی دوسری قسم:** ۔ اہل فترت کی دوسری قسم میں وہ لوگ تھے جنہوں نے عقل و نقل کی مخالفت دل کھول کر کی، حلال و حرام کے بارے میں خود مختار تھے، جس کو چاہا حلال کہا اور جس کو چاہا حرام کہا، شرک کرتے تھے، توحید ان کے پاس نہ تھی، غرض یہ کہ مذہب کے بارے میں اچھے خاصے ڈکٹیٹر تھے، ان کی چند مذہبی رسمیں یہ تھیں۔

۱۔ غلے اور پھلوں میں سے کچھ حصہ اللہ کے نام کا نکالتے، اور کچھ بتوں اور جنات کے نام کا، پھر اگر اتفاق سے اللہ کے حصے میں سے کچھ بتوں کے حصے میں مل جاتا تو اس کو ملا رہنے دیتے اور عکس میں اس کو نکال کر بتوں کے حصوں میں ملا دیتے، اور بہانہ یہ کرتے کہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہے اس کا حصہ کم ہو جانے سے اُس کا ضرر نہیں، اور شرکاء محتاج ہیں اُن کا حصہ نہ گھٹنا چاہیئے۔

۲۔ (الف) بحیرہ: وہ جانور ہے جس کا دودھ بتوں کے نام کر دیتے تھے، کوئی اپنے کام میں نہ لاتا تھا۔

(ب) سائبہ: وہ جانور جس کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے، اُس سے کوئی کام نہ لیتے، جیسے اس ملک میں بعض لوگ سانڈ چھوڑتے ہیں۔

(ج) وصیلہ: ۔ وہ ناقہ اونٹنی ہے جو پہلی بار مادہ بچہ جنے، پھر دوسری بار بھی مادہ بچہ دے، درمیان میں نر بچہ نہ پیدا ہو، اُس کو بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔

(د) حامی: ۔ وہ نر اونٹ تھا جو ایک خاص شمار سے جفتی کر چکا ہو اُس کو بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔

ان جانوروں کو بتوں کے نام پر چھوڑتے اور کہتے کہ یہ اللہ کی خوشنودی کے لئے ہے، اس میں بھی بتوں کا حصہ یہ ہوا کہ عبادت اُن کی تھی اور اللہ کا حصہ یہ ہوا کہ خوشنودی اُس کی سمجھتے تھے۔

۳۔ اپنی دختری اولاد کو قتل کر ڈالتے یا زندہ در گور کر دیتے تھے۔

۴۔ کچھ کھیت بتوں کے نام وقف کر دیتے اور کہتے کہ اس کا اصل مصرف مرد ہیں، اور عورتوں کو اس میں سے کچھ دینا ہماری اپنی رائے پر ہے، اگر ہماری مرضی ہو کچھ حصہ اُن کو دے سکتے ہیں ورنہ وہ اس کا مصرف نہیں۔

۵۔ اسی طرح مواشی کے باب میں بھی ان کا عمل تھا۔

۶۔ جن چوپایوں کو بتوں کے نام مخصوص کر کے چھوڑ دیتے تھے اُن پر سواری اور بار برداری کو جائز نہ سمجھتے تھے۔

۷۔ بعض چوپایہ مخصوص تھے جن پر کسی موقع میں اللہ کا نام نہ لیتے تھے، نہ دودھ نکالتے وقت، نہ سوار ہوتے وقت، نہ ذبح کے وقت۔

۸۔ بحیرہ اور سائبہ کے ذبح کے وقت جو بچہ پیٹ میں سے نکلتا اگر وہ زندہ ہوتا تو اُس کو ذبح کر لیتے اور مردوں کے لئے حلال اور عورتوں کے لئے حرام سمجھتے تھے، اور اگر وہ مردہ ہوتا تو سب کے لئے سمجھتے تھے۔

۹۔ بعض چوپایوں کے دودھ کو بھی مردوں کے لئے حلال اور عورتوں کے لئے حرام سمجھتے تھے۔

۱۰۔ بحیرہ سائبہ، وصیلہ کی تحریم اور تعبّد اور اس کی تابید کے قائل تھے۔

(ماخوذ از بیان القرآن)

اس لیئے فرمایا گیا ہے کہ

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ

ترجمہ:۔ اور جن چیزوں کے بارے میں محض تمہارا جھوٹا زبانی دعویٰ ہے ان کی نسبت یوں مت کہہ دیا کرو کہ فلانی چیز حلال ہے اور فلانی چیز حرام۔ (النحل: ۱۱۶)

**عرب میں بت پرستی کی ابتداء:۔** اس قسم کے لوگ بکثرت تھے، ان میں سے ایک عمرو بن لحی بن قمعہ بھی تھا، اس کی نسبت تو حالاتِ عرب سے واقفیت رکھنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ اہل عرب کو ملت ابراہیمی سے منحرف کرنے اور بت پرستی میں مشغول کرنے والا پہلا شخص یہی ہے کیونکہ یہ شخص سیر و سیاحت کرتا ہوا ملک شام میں وارد ہوا، شام میں اس وقت عمالیق کا

خاندان آباد تھا. سینکڑوں بت اُن کے یہاں موجود تھے. اس نے یہ چیز بالکل نئی دیکھی. مگر دل کو لگ گئی. چنانچہ اُس نے ان لوگوں سے ایک بت مانگ لیا. اور بڑے تزک واحتشام کے ساتھ مکہ میں لایا. خانہ کعبہ میں اس کو نصب کیا. اس بت کا نام ہُبل تھا. اور بحیرہ. سائبہ. وصیلہ بھی اسی کی ایجاد تھی۔

**اہل فترت کی تیسری قسم:**۔ اہل فترت کی تیسری قسم ان لوگوں کی تھی کہ جنھوں نے نہ توحید باری ہی کو سمجھا. نہ شرک کی دلدل میں پھنسے. نہ کسی دوسرے سماوی دین کو اختیار کیا. نہ خود اپنے لئے کسی تہذیب کا اختراع کیا. بلکہ ساری عمران امور سے غفلت میں بسر کی. بے توجہی میں گزاری۔

اہل فترت کی یہ تمام جماعتیں ناری تھیں یا ناجی؟ اس کے جواب میں ہم علامہ سید احمد زینی دحلان کی پر شوکت اور فیصلہ کن تقریر کر دیں جس سے ان کی رائے اہل فترت کے متعلق معلوم ہو سکے. اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح ہو جاوے کہ فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے کافر ہونے یا نہ ہونے کے متعلق ان کے پاس دلائل کا کیا نمونہ ہے فرماتے ہیں کہ:۔

**وَاِذَا انقَسَمَ اَهلُ الفَترَةِ اِلَى الثَّلاثَةِ الاَقسَامِ فَيُحمَلُ مَن صَحَّ تَعذِيبُهُ عَلَى القِسمِ الثَّانِيْ لِاَجلِ كُفرِهِمْ بِمَا تَعَدَّوا بِهِ مِنَ الْخَبَائِثِ، وَقَدْ سَمَّى اللّٰهُ هٰذَا القِسمَ كُفَّاراً وَّ مُشْرِكِيْنَ، فَاِنَّمَا الْقُرْآنُ كُلَّمَا حَكٰى حَالَ اَحَدٍ مِنْـهُمْ سَجَّلَ عَلَيهِمْ بِالْكُفْرِ وَ الشِّرْكِ كَقَولِهِ فِي مَقَامِ الرَّدِّ وَ الْاِنْكَارِ لِمَا ابتَدَعُوهُ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَّلا سَائِبَةٍ وَّلا وَصِيلَةٍ وَّلا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَاَكْثَرُهُم لَا يَعْقِلُونَ وَاِنَّمَا قِيلَ لَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ لِاَنَّهُمْ قَلَّدُوا فِيهِ الآبَاءَ وَهٰذَا شَانُ اَكْثَرِهِمْ بِخِلَافِ الْقَلِيلِ مِنْهُمْ فَاِنَّهُ تَبَاعَدَ عَنْ ذٰلِكَ وَوَحَّدَ اللّٰهَ وَهُمْ اَهْلُ الْقِسمِ الاَوَّلِ، وَاَمَّا الْقِسمُ الثَّالِثُ فَهُمْ اَهْلُ الْفَترَةِ حَقِيقَةً وَهُمْ غَيْرُ مُعَذَّبِيْنَ اِتِّفَاقاً ـ اِذَا عَلِمْتَ ذٰلِكَ تَعْلَمُ اَنَّ وَالِدَيِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ اِمَّا اَنْ يَّكُونَا مِنْ اَهلِ الْقِسمِ الاَوَّلِ كَمَا دَلَّتْ عَلٰى ذٰلِكَ اَشْعَارُهُمْ وَ اَقْوالُهُم الْمَنْقُولَةُ عَنهُمْ فِيمَا تَقَدَّمَ وَ اِمَّا اَنْ يَّكُونَا مِنَ الْقِسمِ الثَّالِثِ لَمْ تَبْلُغْهُمَا دَعْوَةٌ لِتَاَخُّرِ زَمَنِهِمَا وَ بُعدِ مَا بَيْنَهُمَا وَ بَيْنَ الْاَنْبِيَاءِ السَّابِقِيْنَ وَكَوْنِهِمَا فِيْ زَمَنٍ**

جَاهِلِيَّةٍ عَمَّ الْجَهْلُ فِيهَا شَرْقاً وَ غَرْباً وَ فُقِدَ فِيهَا مَنْ يَعْرِفُ الشَّرَائِعَ وَيُبَلِّغُ الدَّعْوَةَ عَلٰى وَجْهِهَا اِلَّا نَفَراً يَسِيْراً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مُفْتَرِقِيْنَ فِي اَقْطَارِ الْاَرْضِ كَالشَّامِ وَ غَيْرِهَا وَمَا عَهِدَ لَهُمَا تَقَلُّب فِي الْاَسْفَارِ سِوَى الْمَدِيْنَةِ وَلَا اُعْطِيَاعُمْراً طَوِيْلاً يَسَعُ الْفَحْصُ عَنِ الْمَطْلُوْبِ مَعَ زِيَادَةٍ اَنَّ اُمَّهٗ ﷺ مُخَدَّرَةٌ مَصُوْنَةٌ مُحْجَبَةٌ فِي الْبَيْتِ عَنِ الْاِجْتِمَاعِ بِالرِّجَالِ لَا تَجِدُ مَنْ يُخْبِرُهَا وَ اِذَا كَانَ النِّسَآءُ الْيَوْمَ مَعَ فَشْوِ الْاِسْلَامِ شَرْقاً وَ غَرْباً لَا يُدْرِيْنَ غَالِبَ اَحْكَامِ الشَّرِيْعَةِ لِعَدَمِ مُخَالَطَتِهِنَّ الْفُقَهَاء فَمَا ظَنُّكَ بِزَمَانِ الْجَاهِلِيَّةِ وَالْفَتْرَةِ الَّذِى رِجَالُه لا يَعْرِفُوْنَ ذٰلِكَ فَضْلاً عَنْ نِسَائِه وَلِهٰذا لَمَّا بُعِثَ ﷺ تَعَجَّبَ اَهْلُ مَكَّةَ وَ قَالُوْا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلاً لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَا نَزَلَ مَلَائِكَةً فَلَوْكَان عِنْدَهُمْ عِلْمٌ مِنْ بَعْثَةِ الرُّسُلِ مَا اَنْكَرُوا ذٰلِكَ وَرُبَّمَا كَانُوْ يَظُنُّوْنَ اَنَّ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ بُعِثَ بِاٰهُمْ عَلَيْهِ فَاِنَّهُمْ لَمْ يَجِدُوْا مَنْ يُبَلِّغُهُمْ شَرِيْعَةً عَلٰى وَجْهِهَا لِدُثُوْرِهَا وَفَقْدِ مَنْ يَعْرِفُهَا اِذْ كَانَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهُمْ اَزْيَدَ مِنْ ثَلَاثَةِ آلَافِ سَنَةٍ

ترجمہ: ۔ جب یہ ظاہر ہوچکا کہ اہل فترت کی تین جماعتیں تھیں تو یہ بھی واضح ہو گیا کہ ان تینوں قسموں میں جس قسم کو معذّب قرار دیا گیا ہے وہ دوسری ہی قسم کے لوگ ہوسکتے ہیں. کیونکہ انہوں نے کفر کیا اور بہت سے خبائث کا ارتکاب کیا. خداوند عالم نے اسی قسم کے لوگوں کو کفار اور مشرک فرمایا ہے. کیونکہ قرآن شریف کو بغور مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جب ان میں سے کسی کا حال بیان فرمایا تو شرک و کفر کے اوصاف قطعی طور پر ان میں ثابت کئے. مثلاً جب ان کے مخترعات کو رد کرنا اور برا کہنا تھا تو فرمایا گیا کہ مَاجَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ الخ کہ اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو دیوتاؤں کے نام پر چھوڑنے کا طریقہ نہیں بنایا ہے. لیکن کفار خدا پر جھوٹا افترا کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر کو سمجھ ہی نہیں ہے۔

ناسمجھ ان کو اسی واسطے کہا گیا ہے کہ انہوں نے بغیر سمجھے بوجھے اپنے باپ دادا کے قدم پر قدم رکھا. بخلاف تھوڑی سی جماعت کے کہ وہ ان خلاف عقل حرکات سے مجتنب اور دور دور رہی اور توحید باری کی قائل ہوئی۔ یہ تھوڑی سی جماعت اہل فترت کی قسم اول ہے. رہی تیسری قسم. تو یہی لوگ صحیح معنی میں اہل فترت ہیں. اور ان کے غیر معذب ہونے اور ناجی ہونے پر علماء کا اتفاق ہے۔

اب جب کہ تم یہ سمجھ چکے تو تم کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین یاتو پہلی قسم میں داخل ہیں کیونکہ اُن کے جو اقوال یا اشعار جو اُن سے منقول ہوئے ہیں یہی ظاہر کرتے ہیں، اور یا تیسری قسم میں داخل ہیں۔ انبیاء کی دعوت و تبلیغ زمانہ کے تأخر اور بُعدِ زمانہ کی وجہ سے نہ پہنچ سکی. علاوہ ازیں وہ ایسے زمانۂ جاہلیت میں تھے کہ جس میں دنیا کا کوئی گوشہ جہالت سے خالی نہ تھا، نہ ایسا کوئی شخص موجود تھا کہ جو آسمانی احکام بتاوے. یا انبیاء کی دعوت کو صحیح طریقہ سے پہنچاوے۔

اہل کتاب کے چند علماء ضرور موجود تھے. جو شام وغیرہ ممالک بعیدہ میں کہیں کہیں موجود تھے. ان لوگوں کے سفر نہ تو مدینہ کے سوا کسی اور جگہ کے لئے ہوئے نہ اتنی عمریں ان کو ملیں کہ حق کی تلاش اور چھان بین کر سکتے. مزید بر آں یہ کہ آپ کی والدہ ماجدہ پردہ نشین تھیں. مردوں کے مجامع میں کبھی آئی ہی نہ تھیں. کہ ان کو کوئی شخص احکام سماوی بتاتا. اور جب کہ ہمارے زمانہ کی عورتوں کا یہ حال ہے کہ باوجودیکہ اسلام اور احکامِ اسلام. عالم کے اطراف میں شائع ہیں۔ پھر بھی اکثر عورتیں احکام اسلامی سے اس لئے ناواقف ہیں کہ وہ علماء کی مجالس میں نہیں آتی ہیں تو زمانۂ جاہلیت کی عورتوں کے متعلق کیا رائے قائم ہو سکتی ہے. جس کی عورتیں تو بجائے خود مرد بھی کچھ نہ جانتے تھے. اور یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے تعجب کا اظہار کیا. اور کہا کہ کیا اللہ نے انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے. اور یہ بھی کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ملائکہ کو نازل فرماتا. پس اگر ان کو بعثت کے متعلق ذرا سا علم بھی ہوتا تو وہ اس کا انکار نہ کرتے. اور بسا اوقات ان کو یہ وہم بھی ہوتا تھا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں ملت ابراہیمی یہی تھی کیونکہ شرعی احکام کو ان تک صحیح طریقہ سے پہنچانے والا کوئی نہ تھا اس لئے کہ ملت ابراہیمی پر تین ہزار سال سے زیادہ زمانہ گزر چکا تھا۔

**زمانۂ جاہلیّت کی ایک تصویر:۔** غرض یہ ہے کہ صدیاں گزر چکی تھیں کہ مخلوق خداوندی کے لئے ہدایت کے راستے مسدود اور ان کے نجات کے طریقے مفقود تھے. قدم اٹھانا دشوار تھا. صرف اپنے خالق، مالک، منعم حقیقی ہی سے غفلت نہ تھی بلکہ وہ ضلالت کے گڑھے میں گر کر کچھ ایسے گھر گئے تھے کہ عقل و دانش سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں ہی کی پرستش نہ ہوتی تھی. راستے کے گرے پڑے پتھر بھی معبود بن کر برا جمان ہو سکتے تھے. پیدا ہونے والے بچے (لڑکے ہوں یا لڑکیاں) قتل کئے جاتے تھے. یہ امر آخر ہے کہ لڑکیوں کو زندہ در گور کرنے کا طریقہ زیادہ رائج تھا زندہ در گور کر دینا موجبات غیرت میں سے تھا نہ کرنا بے غیرتی کی علامت تھی. اس میں قساوت قلبی اس درجہ پر تھی کہ اس بہیمیت کو بھی باپ اور ماں خود اپنے ہاتھوں ہی انجام دیتے تھے. اسی سفاکانہ رسم کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب میں بالخصوص لڑکیاں ملتی ہی نہ تھیں. ادھر ادھر سے عورتیں پکڑ کر لائی جاتیں اور ان سے بقائے نسل کی ضرورت پوری کی جاتی تھی۔

قتل و قتال. خونریزی. وغارت گری کچھ اس طرح طبیعتِ ثانیہ بن گئی تھی کہ تھوڑی سی تحریک اس کے لئے کافی تھی. ذرا ذرا سی بات پر صف آرائی ہوتی اور جنگ چھڑ جاتی تھی. اور سالہا سال رہتی تھی. ہزاروں نعشیں میدان میں بے گور و کفن پڑی ہوتی تھیں. اور گراں بہا دِیات (خوں بہا) کی ذمہ داری پر لڑائی کا خاتمہ یا التوائے جنگ ہوتا تھا۔

معاشرت کا کوئی قاعدہ یا قانون نہ تھا جس کے بازو میں قوت تھی اس کی زبان خود مختار حاکم تھی. اور جس کی تلوار زنگ آلود نہ تھی فتاکی اور سفاکی کے اوقات میں زیادہ جوہر دکھاتی تھی. اُسی کے اشارات و مرضیات شاہی فرامین کی طرح معمول بہا تھے اسی لئے صنفِ نازک بجز قضائے شہوت کے کسی شمار و قطار ہی میں نہ تھی۔

**رسول کی ضرورت:۔** آسمان کا درخشاں آفتاب اپنی لانبی شعاعیں اُس زمانے میں بھی زمین پر آج ہی کی طرح ڈالتا تھا. لیکن ضلالت کی ظلمت زمین پر بسنے والوں کو اندھوں کی طرح ہاتھ پیر مارنے پر مجبور کرتی تھی. ماہتابِ عالم تاب رات کے اندھیرے اور سیاہ سیاہ بادلوں کی تاریکی کو دور کر سکتا تھا۔ مگر قلوب کی سیاہیوں کو ظلم و ستم. تمرد. عناد. اور بد اخلاقی کے اندھیرے کو دور کرنے کے لئے اس کی چمک دمک بے سود تھی۔ دنیا کو ایسے آفتاب کی ضرورت تھی جو دل کی گہرائیوں میں سے سینوں کے اندر سے قلبی عملی ظلمتوں کو دور کرے. ایسے ماہتاب کی خواہشمند تھی جو اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی سے قلوب کو منور اور بدن کو ٹھنڈا کر دے. اسی لئے ارحم الراحمین نے اپنی مخلوق پر رحم فرمایا اور فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم بطنِ آمنہ سے پیدا ہوئے۔

آپ کی ولادت :۔ اس تہذیب وتمدن کے زمانہ میں بھی کہ فن تاریخ قطعی اور یقینی قرار دیا گیا ہے تاریخ کے صفحات بیان واقعات میں مختلف ہو جاتے ہیں۔ تو اگر یہی اختلاف اب سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے (کہ یہ زمانہ جہالت کے شیوع کا تھا) ہو تو در حقیقت قابلِ تعجب نہیں۔ اسی لئے اربابِ تواریخ کی جمہوریت نے کسی ایک کو راجح قرار دے کر قرار دے لیا ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ امور ذیل میں سے ہر ایک مختلف فیہ ہے۔

(۱) کس دن پیدا ہوئے؟ (۲) کس تاریخ کو پیدا ہوئے؟ (۳) کس ماہ میں پیدا ہوئے؟ مگر اس امر کو اکثر نے مانا ہے کہ آپ کی ولادت دوشنبہ کے دن بارہویں ربیع الاول کو اس سال ہوئی ہے جس سال یمن کے بادشاہ نے خانہ کعبہ کو ڈھا دینے کے ارادے سے ہاتھیوں کا لشکر لے کر چڑھائی کی تھی۔ اور بعض تو اس کو اس قدر محقق قرار دے دیتے ہیں کہ یوں بھی فرما دیتے ہیں کہ اس بارے میں سب متفق ہیں۔

لیکن صحیح یہی ہے کہ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ کی ولادت جمعہ کے دن ہوئی۔ یہ امر آخر ہے کہ یہ قول صحیح مسلم کی اس روایت کے خلاف ہے کہ ابو قتادہ فرماتے ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ دوشنبہ کے روزے کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں فرمایا کہ دوشنبہ وہ دن ہے جس میں میں پیدا ہوا ہوں۔ اور اسی دن مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں امام احمد بن حنبل (باسنادہ) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت دوشنبہ کے دن ہوئی اور مکہ کو چھوڑ کر مدینہ بھی دوشنبہ ہی کے دن روانہ ہوئے۔ اور مدینہ میں داخل بھی دوشنبہ ہی کو ہوئے۔ اور وفات بھی دوشنبہ ہی کے دن ہوئی۔ بوقت تعمیر خانہ کعبہ قبائل قریش کی منازعت کو رفع کرنے کے لئے حجر اسود کو بھی آپ نے دوشنبہ ہی کے دن اپنی جگہ پر پہنچایا۔

چونکہ جمعہ کے دن کی ولادت کے متعلق رائے نصوص صریحہ کے خلاف ہے اسی لئے صاحب بدایہ نے فرمایا ہے کہ۔

**هٰذا مَالا خِلافَ فِيه انه وُلِدَ يَومَ الاثْنَين**

ترجمہ:۔ یعنی اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ آپ کی ولادت دوشنبہ کے دن ہوئی۔

(البدایہ والنہایۃ ص ۲۶۰ ج ۲)

**تاریخ ولادت میں اقوال مختلفہ:۔** پھر مورخین کی اکثریت کا بیان یہ ہے کہ ولادت مبارکہ کا مہینہ ربیع الاول تھا، مگر یہ لوگ بھی اتفاق کے باوجود تعین تاریخ میں مختلف ہو گئے بعض ۲ ربیع الاول اور بعض حضرات ۸ ربیع الاول بعض اصحاب ۱۰ ربیع الاول، اور بعض ۱۲ ربیع الاول فرماتے ہیں، اسی طرح ۱۷ ربیع الاول اور ۲۲ ربیع الاول کی بھی تصریحات ہیں۔

اور چونکہ بکثرت روایات سے ثابت ہے کہ آپ پر نزول وحی رمضان المبارک سے ہوا ہے اور ولادت ماہ ربیع الاول میں ہوئی اور یہ بھی روایات صحیحہ سے ثابت ہے کہ آپ کی بعثت چالیس سال کی عمر کے بعد ہوئی تو آپ کی ولادت پر چالیس سال مکمل اسی وقت ہو سکتے ہیں جب کہ آپ کی ولادت ماہ رمضان المبارک میں مانی جاوے ورنہ ساڑھے انتالیس یا ساڑھے چالیس کی عمر مبارک ہو سکے گی، اس لئے ولادت آپ کی ماہ رمضان المبارک میں ہوئی ہے۔

**بَعَثَہُ اللّٰہُ علٰی رَأسِ اَربَعِینَ سنۃً**

(ترجمہ:۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا فرمائی۔)

کی روایت کے ذکر پر حافظ عسقلانی فرماتے ہیں۔

**ھٰذا اِنَّمَا یَتِمُّ علٰی القول بِانہ بُعِثَ فِی الشَّھرِ الَّذی وُلِد فِیہ وَ المشھُور عِند الجَمھُور اَنہ وِلد فِی شَھرِ رِبیع الاَوَّلِ وبُعِثَ فِی رَمضَان فعَلٰی ھٰذا یَکُون لَہ حِینَ بُعِثَ اَربَعُونَ سنَۃً وَ نِصف او تِسعَۃ وَ ثَلاثُونَ وَنصف فمَنِ قَال اَربَعُونَ اَنفی الکَسرَ اَو جبّرَھَا**

ترجمہ:۔ اس روایت کا مطلب اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ یہ معلوم کر لیا جاوے کہ آپ پر نزول وحی اسی ماہ میں ہوا ہے جس میں کہ آپ کی ولادت مبارکہ ہوئی تھی، مگر اکثر علماء تو یہ فرماتے ہیں کہ آپ کی ولادت مبارکہ ماہ ربیع الاول میں اور آپ کی بعثت ماہ رمضان المبارک میں ہوئی ان کی رائے کے مطابق تو بعثت کے وقت پورے چالیس سال ہو ہی نہیں سکتے ہیں، ساڑھے اُنتالیس ہوں یا ساڑھے چالیس، ہاں اکثر علماء کی رائے کو مان لینے کے بعد اس قسم کی روایتوں کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے بیانات میں بیان کرنے والوں کے اعتبار کا فرق ہے کہ بعض نے درمیانی کسر کو ترک کر دیا اور بعض نے اس کو پورا کر دیا، (کیونکہ اس قسم کے مواقع پر یوں ہی بولا جاتا ہے کہ چالیس سال، یوں نہیں کہا جاتا ہے کہ چالیس سال اور اس قدر ماہ اور دن کم یا زیادہ)

**چاہ زمزم کا ذکر۔** زمزم کا وہ کنواں جس کو تڑپتے ہوئے اسمٰعیل کی ننھی ننھی ٹھوکروں نے ظاہر کیا تھا، مرور زمانہ کی وجہ سے مندرس (ناپید) ہو گیا تھا، عبدالمطلب کے ہاتھوں سے پھر ظاہر ہوا، جب تک عبدالمطلب اس کی کھدائی کرتے رہے، اہل مکہ یا ان پر ہنستے تھے یا مزاحمت کرتے تھے، لیکن جب پانی کا کنواں (اور وہ بھی میٹھے پانی کا حجاز میں نایاب تھا) بر آمد ہوا تو ملکیت کی یا شرکت کی بحث شروع ہو گئی، عبدالمطلب اس جماعت کا جو کہ اپنی ہی تھی قوت کے ساتھ مقابلہ نہ کر سکتے تھے، بالآخر ایک کاہن پر فیصلہ موقوف رکھا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ چاہ زمزم "حق بحقدار رسید" کے طور پر عبدالمطلب ہی کو ملا۔

**عبداللہ کی قربانی۔** عبدالمطلب کو اب محسوس ہوا کہ سیادت کے لئے صرف حسن اخلاق ہی کافی نہیں بلکہ قوت کی بھی ضرورت ہے تو نذر کر لی کہ اگر میری صلب سے دس لڑکے پیدا ہوں، تو جب جوان ہو کر میری امداد کے قابل ہوں گے تو میں ان میں سے ایک کو خدا کے نام پر خانہ کعبہ کے سامنے ذبح کروں گا، (یعنی اس کی قربانی کروں گا)

شائد یہ نذر قابل تعجب ہو کیونکہ باپ اولاد کی تمنا کرے، اولاد پیدا ہو، سالہا سال تک اس کی پرورش کی مصیبتیں اٹھائی جاویں اور جب اس حد کو پہنچے کہ قوت بازو بنے، دشمنوں کی مدافعت کرے تو ذبح کرنے کی ٹھان لی جاوے، یہ صحیح کہ عبدالمطلب کے لئے کوئی آسمانی کتاب نہ تھی، کسی صحیح راہب کے پابند نہ تھے، جس کی پابندی میں ایسی مضحکہ انگیز خارج از عقل نذر نہ کرتے، لیکن اگر یہ بھی خیال میں رہے کہ انسان جب سماوی دین کا پابند نہ ہو، خداوندی شمع (آسمانی مذہب) اُس کے سامنے نہ ہو تو وہ اسی طرح کی خارج از عقل اور بعید از فطرت حرکتیں کرتا ہی ہے، پتھروں کو پوجنا ہی کونسی عقل کے موافق ہے، ان کے ساتھ سچے معبود کا معاملہ کرنا ہی کب موافق عقل و دانش ہے، لیکن جب صراطِ مستقیم سامنے نہیں ہے تو گم شدہ بھیڑ، اور آوارہ بکری کی طرح مارے مارے پھرنے کے سوا چارۂ کار ہی نہیں۔

اُن لوگوں پر کیا تعجب کیا جاوے جو اندھیرے ہی میں پیدا ہوئے تھے، تعجب تو اُن پر ہونا ضروری ہے جو کہ آفتاب کی ضوفشانی کے بعد بھی اندھوں کی طرح ٹھوکریں کھاتے ہیں، سیدھے اور ہموار راستے کے ہوتے ہوئے بھی عمیق گڑھوں میں گرتے اور ہلاک ہوتے ہیں،

ٹھنڈی اور میٹھی آبشار کے ہوتے ہوئے بھی پیاسا رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ دریافت کرنے کی چیز نہیں کہ ایسے لوگ کون ہیں؟ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں، رات دن ہم ان کو دیکھتے اور ان کی بے عقلی، بد دینی سے لرزہ براندام ہوتے ہیں، اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، ہر خیر و شر کی تفسیر اور تفصیل ان کے سامنے ہے مگر قبروں کو سجدے یہ کریں، غیر اللہ کے نام کی نذر یہ کریں نام نہاد پیروں کو سجدے یہ کریں۔ ان کی جوان جوان لڑکیاں، بی بیاں ان ابلیس صفت مشائخ کے سامنے آویں، ان کے پَیر دبائیں تعزیوں کی پرستش کرتے ہوئے ان کو دیکھو۔

میں نے بریلی کی جامع مسجد میں دیکھا کہ مغرب کی نماز کے بعد چند نمازی مسجد کی جنوبی جانب چلے، جہاں ایک مزار پختہ بنا ہوا تھا، اور جس طرح نماز میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوئے تھے، اس طرح اس پختہ قبر کے سامنے کھڑے ہوئے۔ اس قدر فرق تھا کہ وہاں کا قیام طویل نہ تھا، نہ خاشعانہ، خاضعانہ، ہیئت تھی، یہاں قیام بھی طویل، چہرے سے خشوع اور خضوع کے آثار بھی ظاہر، مَیں حیرت سے اس ادا کو دیکھتا رہا، جب وہ دیر کے بعد وہاں سے فارغ ہوئے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ ابھی تو آپ نے چند رکعتوں میں بار بار اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔) کہتے ہوئے خدا کے سامنے ہاتھ باندھے تھے مگر بغیر کسی تاخیر کے وہی ہاتھ جو خدا کے سامنے باندھے گئے تھے ایک قبر کے سامنے باندھ کر اپنے قول و عمل دونوں کے خلاف کر دکھایا۔

اگر کوئی دوسرا ہوتا تو شائد مجھ کو چمٹ جاتا، وہابی کہہ کر گالیاں دیتا، مگر بیچارے سنجیدہ آدمی معلوم ہوتے تھے، دیر تک میری گزارش کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے اور جب سمجھ گئے تو غور کرنے کا وعدہ کیا۔

مختصر یہ کہ جب ہم اسلام کی روشن مشعل ہاتھ میں لیکر بھی جانوروں کی طرح بے عقلی کرتے رہتے ہیں تو ہم کو عبدالمطلب کی اس نذر پر متعجب نہ ہونا چاہئے۔

عبدالمطلب کے دس بیٹے (۱) حارث (۲) زبیر (۳) حجل (۴) ضرار (۵) مقوم (۶) ابولہب (۷) عباس (۸) حمزہ (۹) ابوطالب (۱۰) عبداللہ۔ ہوئے اور پروان چڑھے۔

عرب کے لوگ صادق القول ہوتے تھے. خصوصاً نذر کے بارے میں تو ان کے لئے خودکشی سہل تھی مگر نذر کو پورا نہ کرنا دشوار تھا۔

عبدالمطلب نے سب بیٹوں کو جمع کیا, اور ان سے اپنی نذر بیان کی, سعادتمند بیٹوں نے نذر کو سن کر سر جھکادیا, اور کہا کہ آپ ہم میں سے جس کی قربانی کر کے نذر کو پورا کرنا چاہیں وہ حاضر ہے, چنانچہ قرعہ اندازی ہوئی اور قرعہ میں عبداللہ کا نام نکلا۔

عبداللہ اپنے بھائیوں میں سب سے کم عمر تھے, اور کچھ ایسے خصائص رکھتے تھے کہ نہ صرف باپ (عبدالمطلب) کو ان سے زیادہ محبت تھی بلکہ تمام خاندان کے محبوب تھے۔

عبدالمطلب نے بلا تامل عبداللہ کا ہاتھ پکڑا اور اساف و نائلہ (دو بت ہیں) کی درمیانی جگہ میں ان کو لائے تیز چھری ہاتھ میں, سینے پر سوار ہو کر ذبح کرنا ہی چاہتے تھے کہ چاروں طرف سے قریش کے لوگ ٹوٹ پڑے, ہاتھ سے چھری چھین لی, اور کہا کہ جب تک یقین کے ساتھ ان کی قربانی کا حکم نہ ہو ان کو ذبح نہ کرو, آج اگر تم نے ان کو ذبح کر دیا تو ایک نقصان تو یہ ہو گا کہ خاندان کا محبوب جگر بند اُن کے ہاتھوں سے نکل جاویگا, دوسرا نقصان یہ ہو گا کہ بیٹے کو ذبح کرنے کی رسم عام ہو جاویگی, ہر شخص بیٹے کو ذبح کرنے کی نذر کر لیا کریگا, تاکہ تمہاری مساوات حاصل کر سکے۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عبدالمطلب کے نیچے سے بھائی (عبداللہ) کو گھسیٹ لیا جب کہ وہ سینے پر ذبح کرنے کے لئے چڑھ چکے تھے, اور اسی گھسیٹنے کا نشان عبداللہ کے سر میں تا وفات باقی رہا۔ عبدالمطلب کے لئے اب مشکل تھی, نہ تو وہ اپنی نذر ہی کے خلاف کر سکتے تھے, نہ خاندان کی مخالفت ہو سکتی تھی, بالآخر ایک مشہور کاہن کی رائے سے یہ طے ہوا کہ دس اونٹ اور عبداللہ میں قرعہ اندازی کی جاوے, اگر عبداللہ کا نام نکلے تو پھر دس اونٹوں میں اضافہ کر کے قرعہ اندازی کی جاوے, اگر پھر بھی عبداللہ کا نام نکلے تو پھر دس اونٹوں کا اضافہ کر کے قرعہ اندازی کی جاوے اور جب تک کہ اس قرعہ اندازی میں اونٹوں کا نام نہ آجاوے, دس دس اونٹوں کا اضافہ کیا جاتا رہے۔

چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا اور سو اونٹوں کے بعد اونٹوں کا نام قرعہ میں آیا عبدالمطلب ہُبل کے پاس کھڑے ہوئے دعا مانگ رہے تھے, کہ قرعہ اندازی کرنے والوں نے خوشخبری سنائی کہ سو

اونٹ کی قربانی منظور ہو گئی۔ عبدالمطلب نے کہا کہ اتفاقیہ طور اونٹوں کی صورت ہو گئی ہو گی. میں جب تک یقین نہ کروں گا کہ تین مرتبہ قرعہ اندازی کی جاوے اور ہر بار اونٹوں کا نام نکلے. چنانچہ یہی کیا گیا اور ہر مرتبہ اونٹوں ہی کی مقدار مذکور بر آمد ہوئی. تو سو اونٹ ذبح کر دیئے گئے۔ اور اعلان عام کر دیا گیا کہ جس کا دل چاہے ان کا گوشت کھاوے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا اَنَا ابنُ الذَّبِیحَینِ (میرے سلسلۂ نسب میں دو شخصوں کی قربانی ہوئی ہے) اس کا مطلب یہی ہے کہ اول ذبیح (علی التحقیق) اسمٰعیل علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں. دوسرے ذبیح عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں۔

**آپ کے والد کی شادی اور وفات.** ۔ عبداللہ کا نکاح ایک خاندانی شریف زادی آمنہ بنت وہب سے ہوا. اس نکاح کے بعد عبداللہ شام کے ایک شہر غزہ نامی کی جانب بغرض تجارت گئے. اور تاجر بھی ہمراہ تھے واپسی سب کی مدینے کی جانب سے ہوئی تو چونکہ عبداللہ کی ننھیالی قرابت اہل مدینہ سے تھی. اور سفر کی تکالیف نے ان کو بیمار کر دیا تھا. اس لئے انہوں نے رفقائے سفر سے کہا کہ تم مکے جاؤ. میں اپنے ماموؤں کے پاس رہوں گا. بعد صحت آ جاؤنگا. قافلہ مکّہ پہنچا اور عبدالمطلب کو لخت جگر کی بیماری کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے بڑے بیٹے حارث کو مدینہ بھیجا کہ عبداللہ کو ہمراہ لیکر آئیں. سعادتمند بیٹے نے سفر میں پوری عجلت کی. مگر جس وقت پہنچے تو عبداللہ کو دفن کیا جا چکا تھا. واپس آئے اور غمگین باپ کو سارا حال سنایا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بطن مادر میں تھے. اور عبداللہ کی عمر پچیس سال کی تھی۔

**رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یتیمی.** ۔ ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد عبداللہ کی وفات ہوئی ہے اُس وقت کی عمر دو ۲ ماہ سے لیکر اٹھائیس ۲۸ ماہ تک بتائی گئی ہے، ہمارے نزدیک قول محقق یہی ہے کہ عبداللہ کی وفات آپ کی ولادت سے پہلے تھی۔
عمر مبارک چھ سال کی تھی کہ آپ کی والدہ نے وفات پائی. اس کے بعد آپ اپنے دادا عبدالمطلب

کے زیر نگرانی رہے، آٹھ سال کی عمر ہوئی کہ عبدالمطلب بھی دنیا سے رخصت ہوئے۔

**خدیجہ سے نکاح:۔** آپ کی عمر پچیس سال کی تھی کہ آپ کا نکاح حضرت خدیجہ بنت خویلد سے ہوا، آپ کی تمام اولاد (لڑکے ہوں یا لڑکیاں) حضرت خدیجہ سے ہوئی۔ اور کسی بی بی سے کوئی اولاد آپ کی نہیں ہوئی ہاں ان میں سے ابراہیم نامی صاحبزادے ایسے ہیں جو حضرت خدیجہ کے بطن سے نہیں ہیں۔

**اولاد کی مختصر تفصیل:۔** ابراہیم کے سوا بقیہ لڑکوں کے نام یہ تھے (۱) قاسم، انہیں کی نسبت سے آپ کو ابوالقاسم کہا جاتا ہے (۲) طیب (۳) طاہر، عمروں کا تفاوت بھی اسی ترتیب سے ہے کہ ان سب میں بڑے قاسم ہیں اُن سے چھوٹے طیب، اُن سے چھوٹے طاہر۔
صاحبزادیوں کی تفصیل یہ ہے کہ (۱) رقیہ (۲) زینب (۳) ام کلثوم (۴) فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وعنہن اجمعین۔
صاحبزادے تو بعثت سے قبل ہی وفات پا چکے تھے، مگر صاحبزادیوں کو آپ کی بعثت کا زمانہ بھی حاصل ہوا تھا۔ اور سب آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی طرح تارکِ مکہ ہو کر مدینہ پہنچیں۔
ابراہیم ماریہ نامی جاریہ سے پیدا ہوئے جس کو سلطان اسکندریہ نے بطور ہدیہ کے آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔
یہ حالات ہمارے موضوع سے اگرچہ خارج تھے مگر ہم نے ان کا ذکر تبرکاً ضروری سمجھا، اب ہم اس وقت کا ذکر کرتے ہیں جب کہ آپ خلعت نبوت سے اس دنیا میں سرفراز ہوئے۔
**بعثت:۔** اس بارے میں حضرات علماء کے اقوال مختلف ہیں ہمارے نزدیک معتمد قول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے جس کو امام احمد نے الفاظ ذیل سے نقل کیا ہے۔
**عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بُعِثَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَ اُنْزِلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ وَهُوَ ابْنُ اَرْبَعِينَ سَنَةً فَمَكَثَ بِمَكَّةَ ثَلَاثَ عَشَرَةَ سَنَةً وَ بِالْمَدِيْنَةِ عَشَرَ سِنِيْنَ وَ مَاتَ وَهُوَ ثَلَاثٌ وَّ سِتِّيْنَ سَنَةً**

ترجمہ:۔ یعنی آپ کی بعثت و نزول قرآن چالیس سالہ عمر میں ہوا۔ آپ اس کے بعد مکہ میں تیرہ سال تک مقیم رہے پھر مدینہ میں دس سال تک اقامت فرمائی۔ اور تریسٹھ سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی۔ (البدایہ والنہایہ ص ۴ ج ۳)

**نزول وحی:۔** وحی خداوندی دربار خداوندی کا پیام ہے جو اُس کے رسولوں تک پہنچایا جاتا ہے، ہم طبقۂ سفلیٰ کے انسان تو کیا سمجھ سکیں اور کیا بتا سکیں کہ وحی کی حقیقت کیا ہے کیونکہ ہماری بصر اور بصیرت دونوں ہی محدود ہیں شائد وہ مقربان بارگاہ بھی ہم کو صحیح طور پر نہ سمجھا سکیں جو کہ شرف وحی سے مشرف ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ جب فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق سوالات کئے گئے تو آپ نے "کَلِّمِ النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِہِمْ" (یعنی لوگوں سے ان کی عقلوں کے بقدر بات کرو۔) کے مطابق حسّی مثالیں دے کر سمجھانے کی سعی فرمائی لیکن ظاہر ہے کہ مخاطب ہی میں سمجھنے کی اہلیت نہ ہو تو متکلم اپنی قوتِ گویائی سے کیونکر کام لے سکتا ہے۔

اس لئے ہم اس بحث کو تو بالکل ہی ترک کر رہے ہیں۔ کسی درجہ میں یہ چیز قابل بیان ہے کہ نزول وحی کے وقت آپ کی کیفیت کیا ہوتی تھی؟

اور اس بحث کا استیعاب و استقصاء بھی شائد ہم سے نہ ہو سکے لیکن "مَالَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ" (یعنی جو چیز تمام حاصل نہ ہو تو اس چیز کو چھوڑا بھی نہ جائے۔) نے اس پر آمادہ کیا ہے کہ کچھ تھوڑا ساذکر کر دیا جاوے، اور اسی لئے "مشتے نمونہ از خروارے" کے مطابق ہم صرف چند حدیثوں کے نقل پر اکتفا مناسب سمجھتے ہیں۔

**عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا نُزِّلَ عَلَیْہِ الْوَحْیُ کَرِبَ لِذٰلِکَ وَ تَرَبَّدَ وَجْہُہٗ وَ فِیْ رِوَایَۃٍ وَ غَمَضَ عَیْنَیْہِ (صحیح مسلم شریف وغیرہ)**

ترجمہ:۔ عبادۃ بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپ پر اس کی بہت شدت ہوتی تھی، اور چہرہ مبارک کا رنگ فق ہو جاتا تھا، اور ایک روایت میں یوں بھی ہے کہ آپ اپنی مبارک آنکھوں کو بند کر لیتے تھے۔ (صحیح مسلم)

**(قال زید بن ثابت) حِیْنَ نَزَلَتْ "لَا یَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فَلَمَّا شَکٰی ابْنُ اُمِّ**

مَكْتُوْمٍ ضَرَارَتَهٗ نَزَلَتْ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ قَالَ وَكَانَتْ فَخِذُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى فَخِذِيْ وَاَنَا اَكْتُبُ فَلَمَّا نَزَلَ الْوَحْيُ كَانَتْ فَخِذُهٗ تَرُضُّ فَخِذِيْ

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب وہ آیت نازل ہوئی جس میں بتایا گیا ہے کہ بوقت جہاد جان و مال کو جنگ کفار میں لگادینے والے ان لوگوں سے بہت متفاوت ہیں جو کہ جنگ میں شریک ہی نہیں ہوتے ہیں۔ عبداللہ ابن ام مکتوم (نابینا) تشریف لائے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس صورت میں تو ہم جیسے معذور بہت بڑی اخروی دولت سے محروم رہے تو اس میں بذریعہ وحی کے اس قدر اضافہ اور کیا گیا کہ "غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ" (یعنی عذر والوں کے علاوہ) اور میری ران پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ران سہارے لگی ہوئی تھی اور میں وحی کو لکھ رہا تھا ان چند کلمات کے نزول کے وقت میری یہ حالت ہوئی کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ران مبارک کی وجہ سے میری ران ریزہ ریزہ ہوجاوے گی (صحیحین)

قال الامام (بسنده) عن اسماء بنت يزيد قالت: اِنِّيْ لَاٰخِذَةٌ بِزِمَامِ الْعَضْبَاءِ نَاقَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ نَزَلَتْ عَلَيْهِ الْمَائِدَةُ كُلُّهَا وَكَادَتْ مِنْ ثِقْلِهَا تَدُقُّ عَضُدُ النَّاقَةِ

اسماء بنت یزید فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ کی مہار پکڑے ہوئی تھی کہ یکایک سورہ مائدہ کا نزول شروع ہوگیا. اس کا بار اونٹنی پر اس قدر ہوگیا کہ قریب تھا کہ اُس کا بازو ٹوٹ جاوے گا۔ (امام احمد)

ان چند نمونوں سے معلوم ہوسکتا ہے کہ افضل الرسل صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے وقت کیسی شدت ہوتی تھی۔

سب سے پہلا مسلمان:۔ اب یہ قابل عرض ہے کہ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے دولت اسلام سے اول کون مالا مال ہوا؟ علماء اس بارے میں مختلف اللسان والاقوال ہیں. ہم نے اپنے اکابر سے بھی سنا ہے اور محققین امت کا قول بھی ہے کہ:

وَالْجَمْعُ بَيْنَ الْاَقْوَالِ كُلِّهَا اَنَّ خَدِيْجَةَ اَوَّلُ مَنْ اَسْلَمَ مِنَ النِّسَاءِ وَقِيْلَ الرِّجَالِ اَيْضاً. وَ

اَوَّلُ مَنْ اَسْلَمَ مِنَ الْمَوَالِیْ زَیْدُ بْنُ حَارِثَةَ. وَ اَوَّلُ مَنْ اَسْلَمَ مِنَ الْغِلْمَانِ عَلِیٌّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ فَاِنَّهٗ کَانَ صَغِیْرًا دُوْنَ الْبُلُوْغِ. وَ اَوَّلُ مَنْ اَسْلَمَ مِنَ الرِّجَالِ الْاَحْرَارِ اَبُوْبَکْرٍ الصِّدِّیْقُ

ترجمہ:۔ ان تمام مختلف اقوال کو ایک محمل پر اس طرح جمع کیا جاسکتا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تمام عورتوں میں (بلکہ بعض نے کہا ہے کہ سب مردوں سے بھی پہلے) سب سے پہلے مسلمان ہوئیں. اور آزاد کئے ہوئے غلاموں میں سب سے پہلے زید بن حارثہ مشرف باسلام ہوئے. اور نو عمر لڑکوں میں سب سے پہلے حضرت علی بن ابی طالب مسلمان ہوئے. کیونکہ ان کی عمر بوقت اسلام کچھ بھی ہو مگر محقق یہی ہے کہ آپ بوقت اسلام نابالغ تھے. اور آزاد مردوں میں سب سے پہلے مسلمان ہونے والے ابو بکر صدیق تھے (البدایہ والنہایہ ص ۷۹ ج ۳)

اقوال متعارضہ میں اس سے عمدہ تطبیق دشوار ہے. بعض علمی مجالس میں ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی جواب نقل کیا گیا ہے۔

**صدیق اکبرؓ کا اسلام:۔** صدیق اکبر کا اسلام خواص و عوام سب میں زبان زد ہے. ہم اس کا ذکر بھی بطور تبرک کے سرور کائنات علیہ افضل الصلوات والتحیات کے الفاظ میں کرتے ہیں۔

مَا دَعَوْتُ اَحَدًا اِلَی الْاِسْلَامِ اِلَّا کَانَتْ عِنْدَهٗ کَبْوَةٌ وَّ تَرَدُّدٌ وَّ نَظْرٌ اِلَّا اَبَابَکْرٍ. مَا عَکَمَ حِیْنَ ذَکَرْتُهٗ وَ لَا تَرَدَّدَ فِیْهِ

ترجمہ:۔ میں نے کسی سے مسلمان ہونے کے لئے نہیں کہا کہ اس نے میرے کہنے کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا ہو اور فوراً مان لیا ہو. بجز ابو بکر کے کہ جس وقت میں نے ان سے کہا وہ اسی وقت بغیر تردد کے مسلمان ہو گئے (البدایہ ص ۲۷ ج ۳)

اسلام سے قبل ابو بکر کا کفار قریش میں کیا درجہ تھا؟ اس کا جواب (البدایہ والنہایہ ص ۲۱ ج ۳) سطور ذیل میں ملے گا۔

وَکَانَ اَبُوْبَکْرٍ رَجُلًا مَالِفًا لِّقَوْمِهٖ مُحَبَّباً سَهْلًا. وَ کَانَ اَنْسَبَ قُرَیْشٍ لِقُرَیْشٍ وَ اَعْلَمَ قُرَیْشٍ بِمَا کَانَ فِیْهَا مِنْ خَیْرٍ وَّ شَرٍّ. وَکَانَ رَجُلًا تَاجِرًا ذَا خُلُقٍ وَّ مَوَدَّةٍ. وَکَانَ رِجَالُ قَوْمِهٖ یَاْتُوْنَهٗ

وَ یَأْلِفُوْنَہٗ لِغَیْرِ وَاحِدٍ مِّنَ الْاَمْرِ لِعِلْمِہٖ وَ تِجَارَتِہٖ وَ حُسْنِ مُجَالَسَتِہٖ

ترجمہ:۔ ابو بکر سے اُن کی ساری قوم کو الفت تھی اُن کو اپنی قوم سے محبت تھی. وہ سخت گیر نہ تھے. قریش کے انساب سے اور اُن کے چھوٹے بڑے اچھے اور برے واقعات سے سب سے زیادہ باخبر تھے۔

وہ صاحب اخلاق اور بھلائی والے مشہور سوداگر تھے. اُن کی قوم کے لوگ اُن کے پاس آتے رہتے تھے اور بہت سے امور کی بناء پر اُن سے محبت کرتے تھے. مثلاً یہ کہ وہ عالم تھے. سوداگر تھے. اُن کے پاس بیٹھنے والے اُن سے خوش رہتے تھے۔

**حضرت ابو بکر صدیقؓ کی تبلیغ:۔** صدیق اکبر نے مسلمان ہو کر اپنے وقت کو ضائع نہ کیا بلکہ اپنے دوستوں میں جس کی نسبت خیال ہوا کہ اُس کو اچھے اور برے میں تمیز کرنے کا مادہ خدا نے دیا ہے اُسی کے لئے مشعل راہ بن گئے. اُن کی اس سادہ مگر بے لوث تبلیغ سے حضرات ذیل مشرف باسلام ہوئے۔

(۱) زبیر بن العوام (۲) عثمان بن عفان (۳) طلحہ بن عبید اللہ (۴) سعد بن ابی وقاص
(۵) عبد الرحمٰن بن عوف رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

**حضرت طلحہؓ کا اسلام:۔** طلحہ کے اسلام کے متعلق واقدی کی ایک روایت قابل ذکر ہے کہ بصریٰ میں ایک عظیم الشان بازار لگا کرتا تھا اطراف و جوانب سے تجار بھی آتے تھے. اور چونکہ لوگوں کو معلوم تھا کہ اس بازار میں اطراف و اکناف کے سوداگر آتے ہیں. اور اپنے اپنے شہروں سے انواع و اقسام کی چیزیں لاتے ہیں اور ارزاں قیمت پر فروخت کرتے ہیں اس لئے چاروں طرف سے خریدار بھی جمع ہو جاتے تھے. بہت سے لوگ بغرض سیر و تفریح شریک ہوتے تھے۔

طلحہ بھی جا پہنچے. سیر کرتے ہوئے ایک بڑے گرجا کی طرف سے ہو کر گزرے تو دیکھا کہ ایک تارک الدنیا پادری بیٹھا ہوا اپنے خادموں سے کہہ رہا ہے کہ اس بازار کے مجمع میں جاکر یہ

دریافت کرو کہ ان بازار والوں میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جو حرم کا باشندہ ہو۔ طلحہ نے سنا تو خود ہی جواب دیا کہ میں حرم کا باشندہ ہوں۔ آپ کو کیا کام ہے اس نے کہا کہ تم کو احمد کا کچھ حال معلوم ہے؟

طلحہ: کون احمدؐ؟

پادری: عبداللہ کے بیٹے اور عبدالمطلب کے پوتے اُن کا اسی میں مِنْ جَانِبِ اللہ ظہور مقدر ہے۔ وہ آخری نبی ہیں وہ حَرَم سے اٹھیں گے مدینہ میں سکونت اختیار کریں گے۔ خیر خواہانہ طور پر تم سے کہتا ہوں کہ تم ان کے اتباع میں تھوڑی سی بھی تاخیر نہ کرنا۔

پادری کی یہ تقریر طلحہ کے ذہن نشین ہو گئی۔ بازاری ضروریات بعجلت ممکنہ پوری کیں۔ گھر پہنچ کر سب سے پہلے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ملے۔ گفتگو کی حالات معلوم کئے اُن سے معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ نبوت کیا ہے۔ تو انہوں نے دریافت کیا کہ کیا آپ نے اُن کو سچا سمجھا اور اُن کا اتباع کر لیا۔ صدیق اکبر نے فرمایا کہ وہ جو کچھ فرماتے ہیں بالکل ہی سچ ہے۔ چنانچہ طلحہؓ بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دربارِ نبوت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے۔ نوفل بن خویلد بن عدویہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو غصے میں جھلا گیا۔ اس کی بہادری اور غضبناکی زبان زد تھی۔ حتیٰ کہ اس کو شیرِ قریش کا لقب دیدیا گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ ابھی تو "گرفتن بمیل" کا وقت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ "نشائد گذشتن بہ فیل" کی نوبت آجاوے۔ یہ سوچ کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ ان دونوں کو اپنے پاس بلوایا۔ اور قیدیوں کی طرح دونوں کو ایک مضبوط رسی میں جکڑ دیا۔ اسی وجہ سے محدثین ان دونوں کو قرینین کہتے ہیں۔

ابو بکر کی توہین اس سے زیادہ کیا ہو سکتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو بے ساختہ آپ کی زبان سے نکلا اَللّٰھُمَّ اکْفِنَا شَرَّ ابْنِ الْعَدَوِیَّۃِ۔ اے اللہ ہماری طرف سے تو ہی نوفل سے نمٹ لے۔ (البدایہ والنہایہ ص۲۹ ج ۳)

ابو بکر پر تو اس تذلیل کا اثر کیا ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ضعیف الطبع لوگوں کی ہمتیں پست ہو گئیں۔

**مسلمانوں کا پہلا جلسہ عام:** ۔ ابو بکر نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم اس وقت اڑتیس

آدمی ہیں۔ وقت ہے کہ ہم علی الاعلان احکام خداوندی کی تبلیغ کریں. اور حرم کعبہ میں نماز پڑھیں. اقلیت کی بنا پر حضور کو تامل تھا. مگر جاں نثار کا اصرار رد نہ کیا جاسکا. مسلمان حرم میں داخل ہوئے تو اس طرح کہ کوئی اِدھر سے اور کوئی اُدھر سے. اور مسجد حرام میں پہنچ کر ہر ہر شخص اپنی اپنی قوم میں جابیٹھا. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف فرما ہوئے. تو صدیق اکبر نے کھڑے ہو کر حمد و ثنا کے بعد تقریر شروع کی بت پرستی کے تار و پود بکھیر دیئے اور توحید کے دلائل بیان کئے آیات قرآنیہ یہ کہہ کر سنائیں کہ یہ خدا کا کلام ہے۔

**مشرکین کا ردعمل:۔** کفار قریش کے غصہ کی کوئی حد نہ تھی. کہ ایک شخص ان کے آبائی مذہب کی اس طرح کھلے بندوں توہین کر رہا ہے. حاضرینِ حَرَم میں سے جن جن لوگوں کی نسبت یقین تھا کہ یہ لوگ مسلمان ہو چکے ہیں وہ تو اپنی اپنی جگہ پر مضروب یا مجروح ہوئے. بعض اس وجہ سے محفوظ رہے کہ اُن کی برادری نے اُن کو بچالیا بعض اس لئے بچ گئے کہ اُن کا مسلمان ہونا معلوم نہ ہوا تھا لیکن صدیق اکبر کی مظلومیت کی حد نہ تھی. جو چیز جس کے ہاتھ آئی اس کے ذریعہ سے ابو بکر کو مارا. پیروں سے روندا گیا. قریش کے مشہور سردار عتبہ بن ربیعہ نے جوتوں سے مارا. اور اس قدر مارا کہ چہرہ بگڑ گیا۔

ابو بکر بنی تیم کے خاندان میں سے تھے. اس خاندان کو خبر ہوئی تو قومی حمیت کی بنا پر دوڑے ہوئے آئے. مشرکین کو ان سے جدا کیا. اور ابو بکر کو مردوں کی طرح اٹھا کر لائے. جب اس قدر حالت زار دیکھی اور یقین ہو گیا کہ ان کی زندگی ناممکن ہے تو یہ لوگ مسجد حرام میں واپس آئے اور باآواز بلند اعلان کیا کہ اگر ابو بکر مر گئے تو ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ان کے عوض میں عتبہ بن ربیعہ کو ضرور بالضرور جان سے مار دیں گے. یہ قسم معمولی قسم نہ تھی. بنی تیم مکہ میں معمولی خاندان نہ تھا. اس خاندان کی شرافت و سیادت تو مسلّم ہی تھی. اس امر کا تجربہ بھی بارہا کیا جا چکا تھا کہ جب ان میں سے کسی ایک کی زبان سے کوئی بات نکل گئی تو سارے قبیلے نے اس کی ہم نوائی کی اور کہے ہوئے کو کر کے دکھایا. اس بناء پر اس قسم کا چرچا گھر گھر ہو گیا۔

اس اعلان کے بعد واپس ہوئے. ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کے پاس ان کے بوڑھے باپ ابو

قحافہ بیٹھے ہوئے تھے. بار بار پکارتے تھے مگر ابو بکر بیہوش تھے. اس لئے جواب نہ دے سکتے تھے۔

**حضرت ابو بکر کی حضور ؐ سے محبت**.۔ غروب آفتاب کے قریب ہوش آیا تو سب سے پہلے یہی دریافت کیا. کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟ حاضرین کو حیرت ہوگئی کہ ایسا شخص جو زخموں سے نڈھال ہے۔ ہوش آتے ہی اپنے آقا کا حال دریافت کرتا ہے. مگر چونکہ حضور کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا اس لئے اس کا جواب نہ دیا جاسکا۔

اب اطمینان ہو گیا تھا کہ ابو بکر (رضی اللہ عنہ) زندہ ہیں. اس لئے خاندان کے تمام لوگ واپس آگئے. صرف اُن کی والدہ اُن کے پاس رہ گئیں. ان کا نام ام خیر تھا. اُن سے بتاکید کہہ دیا گیا کہ اب ہم لوگ جارہے ہیں. انہوں نے آج دن بھر کچھ نہ کھایا ہے نہ پیا ہے. اگر ہو سکے تو کچھ نہ کچھ کھلا پلا دینا۔

اب ماں اور بیٹے تنہا تھے. ماں کا اصرار تھا کہ کچھ کھالو مگر بیٹے کا یہ حال کہ ہر کروٹ پر حضور کا نام اور خیریت معلوم کرنے کا اشتیاق تھا. بالآخر ماں نے مجبور ہو کر بقسم بیان کیا کہ مجھ کو ان کا کچھ حال معلوم نہیں ہے. صدیق اکبر نے فرمایا کہ آپ امِ جمیل بنت خطّاب کے پاس تشریف لیجاویں! ان کو حالات ضرور معلوم ہوں گے. اس لئے وہ بتا دیں گی۔ والدہ کو کوئی تعلق حضور سے نہ تھا. ان کی طرف سے کوئی مرے یا زندہ رہے مگر ان کا بیٹا بچ جاوے. اس لئے ان کو ضرورت نہ تھی کہ حضور کا حال دریافت کر کے کفار قریش کی نظروں میں اپنے آپ کو مشتبہ کریں. اور یہی وجہ تھی کہ ان کو اس میں تامل تھا. لیکن بیٹے کی محبت نے مجبور کیا کہ حالات دریافت کریں. بالآخر ام جمیل کے پاس تشریف لائیں. اور کہا کہ ابو بکر نے مجھ کو تمہارے پاس بھیجا ہے تاکہ تم سے محمد بن عبداللہ کے حالات معلوم کروں. انہوں نے اب تک نہ ایک نوالہ کھایا نہ ایک گھونٹ پانی پیا ہے. تم بتادو گی تو وہ کھاپی لیں گے۔

امِ جمیل بھی امِ جمیل ہی تھیں. کھٹک گئیں کہ آج قریش کو اشتعال زیادہ ہے. وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس دعوت توحید میں کون کون شریک ہے تاکہ سب کا قلع قمع کر دیں اور اس

درخت کی جڑیں مضبوط نہ ہو سکیں. اس لئے جواب میں فرمایا کہ نہ میں ابو بکر کو جانوں. نہ محمد بن عبداللہ کو پہچانوں، ہاں، مجھ کو تمہارے ساتھ ہمدردی ضرور ہے کہ تمہارے بیٹے آج زیادہ مجروح ہوئے ہیں. اگر تم کہو تو میں تمہارے ساتھ چلوں. ان کی تیمار داری کروں. اور سمجھاؤں. شائد کچھ کھالیں۔

ام خیر بھی ایسی بچی نہ تھی کہ ام جمیل کے اس صاف انکار کی غایت کو نہ سمجھتیں. اس لئے انہوں نے اس کو منظور کر لیا کہ ام جمیل بغرض تیمار داری ابو بکر کے پاس چلیں. ام جمیل. ابو بکر کے پاس آئیں تو ابو بکر کو زخموں سے نڈھال دیکھا. دیکھ کر دل بھر آیا. اور بے اختیاری کی حالت میں زبان سے نکلا کہ جن بدبختوں نے تمہارے ساتھ دست درازی کی ہے وہ بڑے ہی خبیث ہیں، قادر مطلق ان کو پوری سزا دے گا۔

ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ام جمیل کو سامنے کھڑے ہوئے دیکھا تو فوراً فرمایا کہ ام جمیل! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس حالت میں ہیں؟ ام جمیل نے منہ پر ہاتھ رکھدیا اور باہستگی کہا کہ کیا تم یہ نہیں دیکھتے ہو کہ تمہاری ماں قریب میں ہیں. تمہاری ماں ہیں تو ہوا کریں مگر ہیں تو انہیں ظالموں کے خیالات کی. اگر انہوں نے میرا نام کسی پر ظاہر کر دیا تو میرا سارا گھر تباہ ہو جاوے گا. صدیق اکبر بول نہ سکتے تھے. اشارے سے اطمینان دلایا کہ اگرچہ ماں دوسرے خیالات کی ہیں مگر میری محبت کی وجہ سے مجبور ہیں. تمہارا نام کسی پر ظاہر نہ کریں گی. ام جمیل کو اس سے اطمینان ہوا تو دبی زبان سے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیریت سے ہیں. دریافت کیا کہ اس وقت کہاں ہیں؟ ام جمیل نے کہا کہ ارقم کے گھر میں ہیں۔

اس خبر کو سن کر صدیق اکبر کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی. چہرے سے بشاشت ظاہر ہونے لگی. اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے فرمایا کہ خدا کی قسم. پہلے میں سردار دوعالم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی زیارت سے مشرف ہولوں گا اس کے بعد کچھ کھاؤں گا. قسم کو سن کر ان کو یقین ہو گیا کہ اس قسم کا ٹوٹنا ممکن نہیں. چنانچہ جب اندھیرا ہو گیا تو دونوں سہارا دیکر حضور کی خدمت میں لائیں. مسلمانوں کی پریشان حال جماعت نے صدیق اکبر کو گھیر لیا. آپ ؐ نے اُن کو بوسہ دیا. اور ان کی اس حالت زار کو دیکھ کر آپ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

صدیق اکبرؓ نے آپ کے اس تاثر کو محسوس کیا اور خداداد فراست سے معلوم کر لیا کہ اس

وقت جو کچھ بھی مانگا جاوے گا ملے گا. عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر میری جان. میرا مال سب قربان. آپ بالکل افسوس نہ کریں میرے چہرے پر کچھ زخم زیادہ ہیں اور بس. آپ کے سامنے میری والدہ موجود ہیں. ان کو مجھ سے محبت ہے اور غیر معمولی محبت ہے. مجیب الدعوات آپ کی دعاؤں کو قبول فرماتا ہے. آپ ان کے لئے دعافرمادیں کہ خداوند عالم ان کو اسلام کی دولت عطافرمائے۔

صدیق اکبرؓ نے وقت کاانتخاب غلط نہیں کیاتھا. آپ نے اسی وقت دعافرمائی. اسی وقت دعا قبول ہوئی. ام خیر اسی وقت مسلمان ہوگئیں۔

یہ واقعہ ایک مختصر ساواقعہ ہے جس سے ظاہر ہے کہ خلاف عقل بت پرستی کاارتکاب اُن کے اعماقِ عُروق میں ایسا راسخ ہوگیاتھاکہ وہ اس کے خلاف کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے. لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے حضور کی موجودگی میں تقریر کرنی توبجائے خود بات کرنی آسان نہ تھی. زیادہ زور سے بول بھی نہ سکتے تھے. ان حالات کے ہوتے ہوئے ابوبکر کو کیاہوگیاتھاکہ اس پراصرار تھاکہ مسجد حرام میں پہنچ کر کلمۂ توحید کااعلان کیاجاوے. اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ سب کو ساتھ لیجاکر خود ہی تقریر شروع کردی. فریضۂ تبلیغ منصبِ رسالت کے ساتھ تھا. اس منصب پر فائز ہونے کاان کو شوق کیوں ہوگیاتھا. یہ وہی ابوبکر ہیں کہ جب حضور کی عدم موجودگی میں نماز پڑھانی شروع کردی ہے اور اثنائے صلوٰۃ میں حضور تشریف لے آئے ابوبکر نے دیکھ لیاکہ آپ تشریف لے آئے تومصلّے سے پیچھے ہٹ جانے کا ارادہ کیا. حضور نے اشارے سے منع فرمایاکہ تم پیچھے نہ ہٹو. مگرابوبکر نے اس امر کاامتثال نہ کیا اور پیچھے ہٹ کر مقتدیوں کی صف میں کھڑے ہوگئے. حضور نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی بعداز نماز دریافت فرمایاکہ ابوبکر تم نے آج میری بات نہ مانی عرض کیاکہ ابوقحافہ (حضرت صدیق اکبر کے والد کانام ہے) کالڑکااور آپ کی امامت کرے. کسی طرح بھی مناسب نہ تھا۔

ادھر تواس ادب کاخیال کرو کہ امر نبوی کے باوجود امامت کی جگہ پر نہ ٹھہرسکے. دوسری جانب یہ دیکھو کہ خود حضور کو ہمراہ لیجاویں اور آپ کی موجودگی میں تقریر شروع کردیں۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

حقیقت یہ ہے کہ صدیق اکبر مزاج شناس تھے. وہ جانتے تھے کہ وحی کانزول ہوتارہتا ہے.

آپ تبلیغ کے مامور ہیں. یہ تبلیغ ایک نہ ایک دن ہو کر رہے گی. اور جس دن منظر عام پر ہو گی وہ دن نہایت سخت ہو گا اور مکہ کے باشندے اس کو سننے کی تاب نہ لاسکیں گے اور جو کچھ کر سکتے ہیں کر گزریں گے اس لئے

نہ لینا کوئی سودا مول بازار محبت کا  اگر کچھ جان اپنی بیچ کر لیتے تو ہم لیتے

کے موافق صدیق اکبر کو اپنی جاں نثاری کا پہلا عملی ثبوت دینا تھا. اور جو کچھ سمجھتے تھے وہی ہوا. حضور کا فریضہ تبلیغ بھی ادا ہو گیا. مظالم بھی ہوئے اور فخر عالم اس سے محفوظ رہے. پھر اس محبت کی بھی کوئی حد ہے کہ ہوش آتا ہے تو سب سے پہلے حضور کی خیریت معلوم کرنے کا شوق ہے. نہ زخموں کی فکر ہے نہ ظالموں کی شکایت. اگر ہے تو حضور کی جانب سے تشویش ہے. ام جمیل سے بھی معلوم ہو گیا تو جب تک زیارت نہ کر لی چین نہ آیا. تو کیا اب بھی کہا جاسکتا ہے کہ ابو بکر اور ان جیسے دوسرے صحابہ

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ نَفْسِهٖ وَ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ

ترجمہ:۔ "تم میں سے کسی کا ایمان اُس وقت تک کامل نہیں ہے جب تک کہ اُس کی محبت. اپنی. اپنے باپ و اولاد کی اور تمام آدمیوں کی محبت سے زیادہ نہ ہو جاوے۔"

کے مصداق نہ تھے۔

**اسلام کی تدریجی رفتار:۔** یہ وہ وقت تھا کہ اسلام کا نام لیناہی جرم تھا۔ کھلم کھلا اسلام کے احکام بیان ہی نہ کئے جاسکتے تھے. فضائل اسلام، حقانیت اسلام کو سننے کے لئے کوئی طیار نہ تھا. مگر اسلام کی مقناطیسی کشش اپنا کام کر رہی تھی. اس کے حلقہ بگوش ہونے والے ناواقف نہ تھے کہ مسلمان ہو جانے کے بعد سلوک و احسانات کے تمام رشتے ٹوٹ جاویں گے. دوست و احباب بجائے خود عزیز و اقارب سے کسی قسم کی اچھی امید رکھنی حماقت ہو گی. اس سب کے باوجود صاف طبیعتیں، سلیم عقلیں، مصائب کے ان تمام پہاڑوں کو برداشت کرنے کے لئے طیار رہتی تھیں اور کوئی آج حلقۂ توحید میں داخل ہوا. کسی نے کل اصنام و اوثان کی خلاف عقل حکومت سے منہ موڑا. اس وقت مسلمان ہونا. آبائی رسوم کو ترک کرنا. ہر آسائش کو ترک کرنے اور ہر قسم کی مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان شدائد کے باوجود بھی ایسے لوگ تھے جو مسلمان ہونے کے بعد اسلام کو چھپانا پسند نہ کرتے تھے. اور اپنے اسلام کا اعلان کرتے تھے. ان میں پہلی جماعت ان حضرات پر مشتمل تھی. (۱) سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم (۲) ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۳) عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۴) ان کی والدہ سمیہ (۵) صہیب (۶) بلال (۷) مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

**ایمان لانے والوں کی حفاظت کے اسباب:۔** حقیقی حفاظت تو محافظ حقیقی ہی کی طرف سے ہوتی ہے مگر بظاہر اسباب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت (جو کچھ بھی تھی) اس لئے تھی کہ ابو طالب آپ کے لئے سینہ سپر تھے. ابو طالب غریب تھے تو ہوا کریں رؤسائے عرب ان کی وجاہت کے معترف تھے. یہی وجہ تھی کہ کسی کی ہمت نہ تھی کہ اپنی من مانی اذیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا سکے. اور یہی وجہ تھی کہ عرصۂ دراز تک. مختلف تدابیر کے ساتھ اس کی کوشش کی گئی کہ ابو طالب حضور سے جدا ہو جاویں۔

بارہا ابو طالب کو سمجھایا گیا کہ تمہارا بھتیجا نہ صرف یہ کہ آباؤ اجداد کے خداؤں کو برا کہتا ہے بلکہ عبدالمطلب وغیرہ کو جہنمی بھی کہتا ہے. ہم سب کو احمق کہتا ہے. حتیٰ کہ باپ دادا کو بھی نہیں چھوڑتا ہے. گھر گھر میں اختلاف پیدا کر دیا بعض مرتبہ ابو طالب نے آپ سے اس بارے میں نرمی کرنے کے متعلق کہا. مگر آپ نے احکام الٰہی کی تبلیغ میں ذرہ برابر تساہل گوارا نہ کیا. اور صفائی کے ساتھ انکار کر دیا. ان کے بعد صدیق اکبر تھے کہ یہ بھی اسلام اور احکامِ اسلامی کے اِخفاء پر قادر نہ تھے۔

حقیقی محافظ تو خداوند عالم ہی ہے. لیکن بظاہر اسباب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی میں کفار کی طرف سے جو کچھ بھی کمی ہوئی وہ صرف اس وجہ سے ہوئی کہ ابو طالب آپ کے لئے سینہ سپر تھے. اور اس بارے میں یقیناً جامع ضدین تھے. کیونکہ خیالات. عقائد. وغیرہا میں تو کفار قریش کے ہم نوا تھے۔ مگر آپ کی حفاظت اس سے زیادہ کرتے تھے. جس قدر شیرنی اپنے بچے کی کرتی ہے۔

اسی طرح صدیق اکبر بھی اگر کچھ بچ سکے تو صرف اس وجہ سے کہ ان کا خاندان قبائل عرب

میں شریف خاندان تھا. اور صدیق اکبر اپنے خاندان میں ذی عزت تھے. خاندان والے اختلاف خیال کے باوجود صدیق اکبر کو چھوڑتے نہ تھے. اس لئے کفار قریش کو صدیق اکبر کے متعلق من مانی کارروائی کرنے کا موقع مشکل سے ملتا تھا۔

**صحابہ کا مشقت برداشت کرنا اور اسلام میں پہلا شہید:** ۔ ان دونوں کے ساتھ پانچ اور بھی تھے (۱) عمار (۲) ان کی والدہ سمیہ (۳) صہیب (۴) بلال (۵) مقداد۔ ان پانچوں کا بظاہر اسباب کوئی سہارا نہ تھا. اس لئے اِن کی ایذار سانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جاتا تھا. چلچلاتی دھوپ. حجاز کی گرمی. دوپہر کے وقت لوہے کی زرہیں. پہنا کر آفتاب کے سامنے زمین پر لٹائے جاتے تھے. اور ایسی حالت میں جو کچھ مظالم ہوسکتے تھے. وہ توڑے جاتے تھے. ان مصائب سے تنگ آکر بجز حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بقیہ چاروں کے بعض مرتبہ کفار نے جو کہلوانا چاہا وہ کہہ لیا اور جان بچائی لیکن بلال. بلال ہی تھے. بُری سے بُری اور بڑی سے بڑی تکلیفوں کے باوجود اتنا بھی نہ کرتے تھے کہ چپ ہی ہو جاویں. بآواز بلند توحید کا اعلان کرتے تھے. اور اس وجہ سے اور زیادہ تکالیف پہنچائی جاتی تھی. عمار کی والدہ سمیہ شب و روز کی تکلیف برداشت کرتی تھیں لیکن جب اس پر بھی باز نہ آئیں تو ابو جہل نے اُن کے قلب (دل) میں نیزہ مارا اور وہ تڑپ تڑپ کر مرگئیں. اور شہدائے اسلام میں سب سے پہلے درجۂ شہادت انہیں کو حاصل ہوا۔

**لفظی تغیر:** ۔ عمار کی والدہ کی شہادت کے بارے میں اردو تراجم سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابو جہل نے ان کی شرمگاہ کو نیزے سے مجروح کیا تھا. اور اس صدمہ میں ان کی شہادت ہوئی تھی۔

اگر کفار قریش کی عمومی اور ابو جہل کی خصوصی شقاوت پر نظر کی جاوے تو یہ بیان زیادہ مستبعد نہیں ہے مگر ہم نے اس واقعہ کو البدایہ والنہایہ سے لیا اور اس میں ہے۔

طَعَنَهَا اَبُوْ جَهْلٍ بِحَرْبَةٍ فِيْ قَلْبِهَا ۔ ابو جہل نے نیزے سے ان کے قلب کو مجروح کیا۔

اور ذمہ داران طباعت نے اس نسخہ کی تصحیح میں قابل تحسین سعی کی ہے. اس لئے اسی کو ترجیح دی ہے اور جن لوگوں نے شرمگاہ کے زخمی کئے جانے کے واقعہ کو بیان کیا ہے ان کے پیش نظر وہ نسخے

ہیں جن میں بجائے فِیْ قَلْبِھَا کے فِیْ قُبُلِھَا مقلوباً لکھا گیا ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے دریافت کیا کہ ابتدائے زمانۂ اسلام میں بعض حضرات نے قلبی اعتقاد کے بغیر صرف زبان سے کلمات کفر کہے یا ان کی تصدیق کی، تو کیا ایسی تکلیفیں دی جاتی تھیں کہ یہ لوگ جان بچانے کی کوئی اور صورت ہی نہ دیکھتے تھے۔ تو فرمایا۔

**نَعَمْ، وَ اللّٰہِ اِنْ کَانُوْا لَیَضْرِبُوْنَ اَحَدَھُمْ وَ یُجِیْعُوْنَہٗ وَ یُعَطِّشُوْنَہٗ حَتّٰی مَا یَقْدِرُ اَنْ یَّسْتَوِیَ جَالِسًا مِنْ شِدَّۃِ الضُّرِّ الَّذِیْ بِہٖ حَتّٰی یُعْطِیَھُمْ مَا سَاَلُوْہُ مِنَ الْفِتْنَۃِ حَتّٰی یَقُوْلُوْا لَہُ اللَّاتَ وَ الْعُزّٰی اِلٰھَانِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَقُوْلُ نَعَمْ اِفْتِدَاءً مِّنْھُمْ بِمَا یَبْلُغُوْنَ مِنْ جَھْدِھِمْ**

ترجمہ:۔ بے شک، خدا کی قسم، ان مسلمانوں میں سے جو اُن کے ہتّے چڑھ جاتا تھا اُس کو اس قدر مارتے پیٹتے، بھوکا پیاسا رکھتے تھے کہ وہ اچھی طرح سے سنبھل کر بیٹھ بھی نہ سکتا تھا، اور یہ مظالم اُس پر برابر توڑے جاتے تھے حتیٰ کہ جو کچھ یہ ظالم چاہتے تھے وہ یہ کہتے تھے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب یہ لوگ کہتے تھے کہ خدا کے علاوہ، لات اور عُزّیٰ دونوں معبود ہیں؟ تو یہ مظلوم جان بچانے اور ناقابل برداشت تکالیف سے بچنے کے لئے ہاں کہہ دیتے تھے۔

(البدایہ والنہایہ ص۵۹ ج ۳)

**ابو جہل کی مکاریاں:۔** ابو جہل کچی گولیاں کھیلا ہوا نہ تھا، وہ خدا کے رسول اور اُس کے دین کی قوت کو سمجھتا تھا، اور اسی لئے اُس کی پوری سعی یہ تھی کہ یہ درخت ابھی اکھاڑ دیا جاوے جب کہ بظاہر انگلیوں سے اکھاڑے جانے کے قابل ہے، اس میں اگر تھوڑی سی فرو گزاشت بھی ہوئی تو بات قابو سے باہر ہو جاویگی، اسی لئے وہ اُن لوگوں کی فکر میں رہتا تھا جو کہ مسلمان ہو جاتے تھے یا ان پر مسلمان ہونے کا شک کیا جاتا تھا، جس شخص کی نسبت اس کو خبر ملتی تھی وہ معلوم کرتا تھا کہ یہ شخص کس قسم کا ہے، اور جس وضع کا ہوتا تھا اُس کو اُسی قسم کا خوف دلاتا تھا، مثلاً ایک شخص اپنی جماعت میں ذی عزت ہے، لوگ اُس کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، اُس کی بات مانتے ہیں، اُس کے مشوروں کو اچھا سمجھتے ہیں تو اُس کے پاس جاتا اور کہتا کہ ہم کو تمہارے اسلام کا

پتہ لگ گیا ہے. لیکن یہ سودا ستانہ پڑے گا ہم تمہارے خاندان کے ایک ایک فرد کو بتادیں گے. کہ تم احمق اور ناقابل عزت ہو. نہ تمہاری عقل صحیح ہے نہ فکر صائب ہے. اور جب تمہارے خاندان کے افراد تم کو ایسا سمجھنے لگیں گے تو تمہاری عزت خاک میں مل جاوے گی تمہارا خاندان عزت والا مشہور ہے کیوں اپنے خاندان کی عزت کو خاک میں ملاتے ہو۔

اگر کسی تجارت پیشہ کی طرف سے مسلمان ہو جانے کا اندیشہ ہوتا تھا تو اُس کو بائیکاٹ کی دھمکی دے کر تجارتی خسارہ یاد دلا کر تشویش پیدا کرتا تھا۔

اور اگر کوئی کمزور شخص ہوتا تھا تو اس کو مار پیٹ کر دھمکیوں سے مرعوب کر دینا آسان تھا۔

ولید بن مغیرہ کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ولید. حضور کی خدمت میں حاضر ہوا. حضور نے اس کو کلام الٰہی کی کچھ آیتیں سنائیں. کافر تھا. بت پرست تھا. لیکن صاحب زبان تھا. کلام کی عظمت اور اس کے علوّ سے ناواقف نہ تھا. اس لئے متأثر ہوا۔

کسی نے ابو جہل کو خبر کر دی کہ ولید بھی ہاتھ سے نکلا. ایک ہی دفعہ میں قرآن کی آیتوں کے سننے سے اُس پر کافی اثر ہو چکا. بس ایک آنچ کی کسر ہے. اگر ایک دفعہ زبان مبارک سے چند آیتیں اور سن لے گا تو کسی قسم کی پرواہ کے بغیر مسلمان ہو جاویگا۔

ابو جہل اس قسم کے واقعات سے ناواقف نہ تھا. وہ فوراً ولید بن مغیرہ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا کہ ولید! مبارک ہو. آج سب نے مل کر تمہارے لئے چندہ جمع کرنے کا ارادہ کر لیا ہے. امید ہے کہ اچھی خاصی رقم جمع ہوگی اور تم کو ملجاویگی. تم اپنی ضروریات سے نجات پاؤ گے ولید چندہ کا نام سن کر تو برافروختہ ہوا ہی تھا. یہ سن کر اور بھی مشتعل ہو گیا کہ مجھ کو محتاج سمجھ کر چندہ کیا جارہا ہے. تیوری بدل کر بولا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ ابو جہل نے متانت کے ساتھ منہ بنا کر جواب دیا کہ اس میں کیا حرج ہوا. آخر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس اسی لئے تو گئے تھے. پھر اگر خاندانی لوگوں نے یہ چاہا کہ تم ان سرپھرے ہوئے لوگوں کی طرح اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ کو خیرباد نہ کہو. اور خاندان ہی میں رہو اور تمہاری ضروریات کی کفالت ہو جاوے. آخر تم جو آباؤ اجداد کی عزت بیچنے پر تل گئے ہو تو اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ تم کو افلاس نے مسلمانوں کی غلامی قبول کرنے پر قبول کیا ہے۔ ولید نے کہا کہ غلط اور بالکل غلط ہے. قریش کا

بچہ بچہ واقف ہے کہ جس قدر دولت میرے پاس ہے وہ کہیں زیادہ ہے، کوئی شخص ہے کہ اس میں میری مساوات کر سکے، ایسی صورت میں میں افلاس سے ڈر کر یا دولت کے لالچ کی وجہ سے اپنی ناک کٹوا سکتا ہوں، ابو جہل نے کہا کہ میں نے تو ان لوگوں سے یہی کہا تھا کہ ولید اپنے آباؤ اجداد کے طریقے پر پختگی کے ساتھ قائم ہے، اس کے لئے ناممکن ہے کہ اپنی عزت، اپنے باپ دادا کی عظمت کو اپنے ہاتھوں سے خاک میں ملا دے، مگر کیا کیا جاوے کہ لوگوں کے دل میں تمہارے وہاں جانے سے، قرآن سننے سے، چہرے پر تأثر کے آثار سے لوگوں نے اسی قسم کی چہ میگوئیاں شروع کر دی ہیں، اور تم جانتے ہو کہ جو بات مشہور ہو جاتی ہے اس کی تردید بہت دشوار ہوتی ہے۔ ولید یہ سن کر سکتے میں رہ گیا، اور کہنے لگا کہ میری بے عزتی تو خواہ مخواہ ہوئی، یہ تو بے پر کا کبوتر بن گیا، آخر اس کا علاج میرے پاس کیا ہے۔

ابو جہل دل میں خوش تھا کہ میرا جادو چل گیا، کہنے لگا کہ ابھی تک تو اس کی تردید اختیار میں ہے۔ ولید نے کہا کہ کیونکر؟ ابو جہل نے کہا کہ آپ میرے ساتھ چلیں میں سب کو جمع کروں گا، آپ اُن سب کے سامنے کچھ ایسے کلمات کہہ دیں جن سے وہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ ولید مسلمانوں سے بے تعلق ہے، اس کے بعد پھر کس کی مجال ہے جو آپ کی نسبت ایک لفظ بھی کہہ سکے، ولید نے کہا کہ یہ سہل ہے، مگر بدظنی تو قرآن کی چند آیات سننے کی وجہ سے پیدا ہوئی، اس کے متعلق کیا کہوں؟ ابو جہل نے کہا کہ بے شک اس کے متعلق کہنا ضروری ہے، یہ کہہ دینا کہ شاعرانہ کلام ہے۔ ولید نے کہا کہ ایسی بات نہ کہی جا سکے نہ سننے والوں کے لئے ذہن نشین ہو سکے، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنی اس عمر میں سینکڑوں شاعروں کے مضامین سنے ہیں اس کلام کو شعر سے کوئی مشابہت ہی نہیں۔ ابو جہل نے کہا کہ اگر آپ انہیں خیالات میں رہے تو لوگوں کی یہ بدظنی دور نہیں ہو سکتی ہے، ولید نے کہا کہ اچھا کچھ سوچ لینے دو، اس کے بعد کہوں گا، کیونکہ یہ کلام تو کچھ ایسا شیریں اور زود اثر ہے کہ سننے ہی میں نہیں آیا، ابو جہل نے کہا کہ تاخیر کی گنجائش نہیں، آپ خاندان کے بڑے شخص ہیں۔

بڑوں کی چھوٹی سی بات بھی بڑی ہوتی اور جلد مشہور ہو جاتی ہے، اور بات بھی بدنامی کی، بدنامی بھی آباؤ اجداد کے عزّ و شرف کی۔ ولید گھبرا گیا اور سوچ کر کہا کہ اگرچہ میرا دل تو قبول نہیں کرتا مگر یہ کہہ دینا کہ یہ کلام ساحرانہ ہے۔ ابو جہل نے کہا کہ صحیح ہے یہ کہہ دینا کافی ہو جاویگا چنانچہ یہی ہوا

کہ خاندان کے سربر آوردہ لوگوں کے سامنے ولید نے یہی کہا، اور اس طرح اسلام سے محروم رہا۔ (البدایہ والنہایہ ص ۶۱، ج ۳)

ولید نے یہ جو کچھ کیا اور کہا وہ درحقیقت عزت کے بت کی پرستش تھی، ابو جہل کی تقریر نے اس کو مسحور کر دیا تھا اور وہ سمجھ گیا تھا کہ عزت پر حرف آجاوے گا، اور جو کچھ کہا اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کہا، مگر اس ناپسندیدگی کے باوجود اس گناہ کا اثر یہ ہوا کہ اس کے دل میں بھی یہی خیال راسخ ہو گیا کہ اسلام کی مخالفت پوری قوت کے ساتھ کرنے کی ضرورت ہے۔

**اعمال کا آپس میں تعلق:۔** علما کی یہ رائے غلط نہیں ہے کہ جس طرح محاسن اور مامورات ایک سلسلہ میں منسلک ہیں اسی طرح قبائح اور منہیات میں بھی ایک قوی رشتہ ہے، یعنی دونوں میں مقناطیسی طریقے پر قوت جاذبہ ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ انسان جب کسی ایک اچھے کام کو کرتا ہے تو اس کے دل میں اس سے آگے بڑھ کر دوسرے نیک کام کا ارادہ پیدا ہوتا ہے، اور اس کے بعد آگے بڑھتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان مرتبہ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب انسان کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے تو طبیعت میں برائی سے نفرت میں کمی آجاتی ہے، اور اس کے بعد دوسری برائی خواہ اس سے بڑی ہی کیوں نہ ہو کرنے کی اس میں جرات اور جسارت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ اس کو کر گزرتا ہے، اس کے بعد اور زیادہ جرات پیدا ہوتی ہے، اگر توفیق خداوندی نے اعانت نہ کی اور وہ اسی طرح ایک ایک قدم بڑھتا گیا تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندقہ شرک، کفر، اور دیگر معاصی کے انتہائی مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے علمائے راسخین (رحمہم اللہ) کو مستحبات کی تاکید اور مکروہات اور صغائر ذنوب پر سخت زجر کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے، کیونکہ جس طرح ایک مستحب کے بعد سلسلہ بسلسلہ انسان ورع و تقویٰ کے مرتبۂ عالیہ پر پہنچ سکتا ہے اسی طرح مکروہات یا صغائر ذنوب میں مبتلا ہو کر خلود فی النار کا واجب الاستعاذہ مرتبہ بھی مل سکتا ہے۔

مثلاً نزلہ، زکام، وغیرہ ان امراض کے معالجے کے لئے کسی حاذق تجربہ کار طبیب کے پاس کوئی مریض گیا، طبیب نے اس کو کثیر الادویہ نسخہ پینے کے لئے لکھ دیا، اور غیر محدود اشیاء سے پرہیز اور بہت سی حسن معاشرت (مثلاً ٹھنڈے پانی سے نہانا شبنم میں

سونا) سے بتاکیدِ اَکید منع کر دیا، مریض کہتا ہے کہ طبیب وہمی ہے، دو چار چھینکیں معمول سے زیادہ آجاتی تھیں، ناک سے کچھ رطوبت، ریزش ہو جاتی تھی، اس نے اس معمولی مرض کو پہاڑ بنادیا، نہ اس پرہیز کی ضرورت ہے نہ ان دواؤں کی، بالجملہ اس نے اس پر عمل نہ کیا نتیجہ ظاہر تھا کہ زکام بگڑ گیا، اور زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ سل و دق میں مبتلا ہوا، اوز اس طرح مبتلا ہوا کہ تیمار دار بھی تیمار داری کرتے کرتے عاجز آگئے، اور دعا کرنے لگے کہ اللہ تعالیٰ اب اس سے ہم کو نجات دے، طبیب احمق نہ تھا، وہ جانتا تھا کہ اگر اس چھوٹے سے مرض پر توجہ نہ کی گئی تو یہ مرض جان لے کر پیچھا چھوڑے گا اسی لئے اس نے پوری احتیاط کے ساتھ مریض کو ہدایات کی تھیں، لیکن مریض نے مرض کو آسان اور طبیب کی ہدایت کو ہذیان قرار دیا اور اس کی سزا میں مبتلا ہوا۔

**گناہ صغیرہ کا وبال:۔** اسی طرح علماء ربّانیّین بھی جانتے ہیں کہ چھوٹے سے چھوٹا گناہ بھی جب بگڑتا ہے یعنی اُس کا مرتکب اُس کو حقیر سمجھتا ہے یا اُس پر نادم نہیں ہوتا تو یہ لذت ایک قدم اور آگے رکھواتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ یہ جسارت ان معاصی کبیرہ خبیثہ میں مبتلا کر دیتی ہے کہ دوست و اقارب بھی دعائیں کرنے لگتے ہیں کہ یہ شخص نیست و نابود ہو جاوے اور شائد یہی وجہ ہو کہ ترک صلوٰۃ کو کفر قرار دیا گیا ہے، کیونکہ ترکِ صلوٰۃ کے بعد توبہ نہ کی، تو اس خباثت نے اور فرائض کے ترک کو بھی معمولی قرار دیا، اور ہوتے ہوتے (نعوذ باللہ) وہ ہوا جو نہ ہوتا تھا۔ یہی حالت ولید بن مغیرہ کی تھی کہ اس وقت تو عزت و جاہ کے نمائشی محبوب کے جلوے نے اس کو مجبور کیا کہ وہ جاننے کے باوجود اس کلام کو ساحرانہ کلام کہہ دے، مگر یہ انکار اسی حد تک نہ رہا، بلکہ اسی سال جب حج کے لئے اطراف حجاز سے لوگوں کے آنے کا وقت آیا تو ولید ہی نے قریش کی اس جماعت کو جو در حقیقت ائمۃ الکفر کا گروہ تھا بلوا کر اس میں مشورہ کیا کہ وقت آگیا ہے کہ باہر سے لوگ حج کے لئے آویں، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن سے ملیں، ادھر تو وہ لوگ خالی الذہن ہوں گے، اُدھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سحر بیانی ہوگی، سمجھ لو کہ کس قدر جماعت کثیرہ اُن کے ساتھ ہو جاویں گی، اگر مکے کے اندر ہم نے اسلام کو روک بھی دیا تو کیا فائدہ ہوا جب کہ مکے سے باہر اسلام کی اشاعت ہو گئی۔

**اسلام سے قبل عرب کی مذہبی و معاشرتی حالت:۔** اس سے قبل کہ ہم یہ بتائیں کہ اس مبحث میں کیا طے ہوا؟ یہ بتادینا ضروری ہے کہ بعثت مبارکہ سے قبل بھی حج کیا جاتا تھا، اور شائد یہ حج ملت ابراہیمی کی مسخ کردہ صورت تھی، کیونکہ اس میں مادر زاد ننگے ہوکر خانہ کعبہ کا طواف کیا جاتا تھا، اور یہ سمجھتے تھے کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کئے ہیں وہ ناپاک ہیں ان ناپاک کپڑوں کو دربار خداوندی میں لیجانا گستاخی ہے، دوسرا امر ان کی جہالت اور جنگ آرائیوں کے شوق کے باوجود اشہر حرم (بزرگ مہینوں، رجب ذیقعدہ ذی الحجہ، محرم) کی غایت درجہ کا تعظیم کا تھا، اس طرح کہ لوٹ مار، غارت گری اور قتل و قتال ان کا ایک دل خوش کن مشغلہ تھا، ذرا ذرا سی بات، چھوٹے چھوٹے سے حیلوں پر برسوں جنگ ہوتی تھی اور طرفین کے سینکڑوں آدمی کام آتے تھے، اس تصادم اور تناطح کے شوق کا اگر صحیح نمونہ دیکھنا ہے تو عرب قدیم کے ایک شاعر کا یہ شعر سن لیجئے۔

وَاَحْیَانًا عَلیٰ بَکْرٍ اَخِیْنَا اِذَا مَا لَمْ نَجِدْ اِلَّا اَخَانَا

قتل و غارت گری کے شوق اور عادت نے ہم کو اس درجہ مضطر کر دیا ہے کہ اگر ہم کو کسی وقت کوئی اجنبی شخص لوٹنے اور جنگ کرنے کے لئے نہیں ملتا ہے تو ہم اپنے خاندانی بھائیوں اور اقارب کو لوٹ کر اپنی پیاس بجھالیتے ہیں۔

فی الحقیقت ان کے رسم و رواج کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس شعر میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں ہے پس ایسی صورت میں اگر ان میں سے کسی کو کسی قصور کا بدلہ لینا ہوتا تھا تو بڑی عزت اس میں تھی کہ قصوروار کے ساتھ ساتھ اُس کے اقارب، معین و مددگار وغیرہم بھی غیر محدود افراد اس جرم کی سزا پائیں خواہ قصوروار کے قصور میں شرکت اُن کی برائے نام بھی نہ ہو، لیکن اس سے کم درجہ کی عزت یہ بھی تھی کہ قصوروار سے پورا پورا بدلہ لے لیا جاوے، جانی اور بدنی بدلہ اچھا بدلہ تھا، لیکن اس میں بھی کوئی مجبوری حائل ہو تو مالی تاوان جس قدر زیادہ لیا جاوے قابل عزت ہے، حتیٰ کہ بعض مواقع پر مالی تاوان کے ساتھ مینڈھا بھی لیا گیا جو اس قدر عمر کا، اور فلاں رنگ کا ہو اور اس کی پیشانی پر اس طرح کے داغ ہوں وغیرہ وغیرہ، ان تمام قیود اور پابندیوں کا نفع اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ قصوروار اس قسم کی چیزوں کو ڈھونڈنے میں مصائب برداشت کرے، قصوروار کو معاف کر دینا اُن کی کتابِ عزّت و فخر میں کوئی قابلِ حمد فعل نہ تھا۔

اس سب کے ہوتے ہوئے بھی اَشہُرِ حُرُم میں اگر بیٹے یا باپ کا قاتل بھی سامنے سے گزر تا تھا تو اس سے تعرض کرنا نا ممکن تھا۔ ان مقدس مہینوں میں کسی کے درپے آزار ہونا ناقابلِ تلافی اور نالائقِ عفو جرم تھا جس کی جرأت کسی میں بھی نہ تھی. اور یہی وجہ تھی کہ ان مہینوں میں کھلے بندوں ہر شخص بغیر کسی قسم کے خوف و خطر کے آزادانہ پھرتا تھا. اور اپنے آپ کو ہر قسم کی دستبرد سے محفوظ خیال کرتا تھا۔ اور اسی وجہ سے سفر بکثرت کیا جاتا تھا. اور مروجہ حج کے لئے بکثرت لوگ آتے تھے۔ اس کو سن کر آپ نے بھی خیال کر لیا ہوگا کہ ولید کو اس ہجومِ کثیر کے زمانہ میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام سے کس قدر وحشت ہوئی ہوگی۔

**اسلام سے روکنے کے لئے کفار کی تدبیریں:۔** بہت دیر تک غور و خوض کر کے. جرح و قدح کے بعد یہ طے ہوا کہ مکہ کے چند ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جاوے جو مکے کے ان تمام راستوں پر رہیں جو باہر کے مسافروں کو لے کر اندر آتے ہیں. جس راستہ سے کوئی قافلہ گزرے اس راستہ پر مقرر کردہ شخص کا یہ فریضہ ہے کہ اس قافلے کے ساتھ گھل مل جاوے. اور اس خلا ملا کو اس درجہ پر پہنچا دے کہ اہل قافلہ کو اس پر پورا اعتماد ہو جاوے اس کے بعد یہ شخص بطور اظہار واقعہ کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی برائیاں اس قدر ذہن نشین کر دے کہ لوگ ان کی صورت سے نفرت کرنے لگیں. اور ہر شخص دل ہی دل میں عہد کرے کہ نہ ان کی صورت دیکھے گا نہ اپنی صورت ان کو دکھاوے گا. اس تجویز کو منظور کیا گیا ، اور خدا کے سچے رسول کو ساحر اور کلام الٰہی کو ساحرانہ کلام قرار دے کر کچھ کامیابی بھی حاصل کی۔

**حبشہ کی جانب ہجرت:۔** ناقابل برداشت ایذائیں. ناقابل تحمل تکلیفیں اُٹھانے کے بعد مسلمان مرد اور عورتوں کی ایک پوری جماعت فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لیکر حبشہ چلی گئی. کفار قریش نے بہت سے تحفے اور ہدایا دے کر ایک وفد بھیجا تاکہ نہ صرف شاہی حکم ان کے اخراج کا دیا جاوے بلکہ ان تمام غریب الوطنوں کو اس وفد ہی کے زیر حراست مکہ ہی کی واپسی پر مجبور کیا جاوے۔ حبشہ کا حکمران اگرچہ عیسائی تھا مگر نا سمجھ نہ تھا. اس وفد کی درخواست پر مہاجرین کو بلایا اور تحقیق کی اور حقیقت حال کے سمجھ لینے کے بعد واپس کرنے سے انکار کر دیا.

اور یہ وفد ناکام واپس آیا۔

**حضرت عمر فاروقؓ کا اسلام:۔** اس کے بعد ہی حضرت عمر کے اسلام کا واقعہ ہوا. جس کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا نہیں ہے. بالاختصار اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینے کے ارادہ سے یکّہ و تنہا شمشیر بکف ہو کر چلے تھے اور صحابیت مل گئی اور صحابیت بھی وہ ملی کہ از شرق تا غرب "عمر" کا نام آفتاب کی طرح روشن ہے۔

مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے چاہا کہ میرا مسلمان ہو جانا کفار قریش کے لئے نمونۂ قیامت ہو گا. اس لئے جو کچھ ہونا ہو وہ ایک ہی دفعہ ہو جاوے. اس لئے غور کیا کہ سب سے زیادہ پیٹ کا ہلکا. کسی راز کو دل میں نہ رکھ سکنے والا کون ہے۔ فوراً یاد آگیا کہ جمیل بن معمر اس بارے میں زبان زد ہے. اور اس میں خصوصیت یہ ہے کہ اس سے کوئی بات کہہ کر جس قدر زیادہ راز داری کے لئے کہو اسی قدر وہ زیادہ اشاعت کرتا ہے. بقول بعض عوام کے اس کے پیٹ میں کوئی بات سماتی ہی نہیں ہے. جمیل کا خیال آتے ہی حضرت عمر خوش ہو گئے. اس کے گھر پہنچے آپ کے صاحبزادے "عبداللہ بن عمر" آپ کے ساتھ تھے. جمیل کو گھر سے بلوایا اور رازدارانہ طریق پر آہستہ سے کہا کہ جمیل! میں تو مسلمان ہو گیا ہوں. جمیل نے یہ سنا اور فوراً خانہ کعبہ کی طرف چلا. یہ وقت تھا کہ خانہ کعبہ کے اردگرد قبائل اور اقوام کی پارٹیاں جمع تھیں. ہنسی مذاق میں سب مصروف تھے. جمیل نے وہاں پہنچتے ہی ایسے موقع پر کھڑے ہو کر کہ ایک ہی دفعہ میں سب سن لیں بآواز بلند کہا کہ بھائیو! عمر بد دین ہو گیا. حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیچھے پیچھے تھے فرمایا کہ جمیل نے غلط کہا. میں بد دین نہیں ہوا ہوں بلکہ مسلمان ہو گیا ہوں اور یہ کہتے ہی بآواز بلند کلمہ توحید پڑھا۔

**اسلام کی خاطر حضرت عمرؓ کا تکلیف برداشت کرنا:۔** یہ پہلا موقع تھا کہ اس جرات کے ساتھ مشرکین مکہ کی جماعتوں کی موجودگی میں. خانہ کعبہ کے اندر اور باہر رکھے ہوئے بتوں کے سامنے خدائے واحد کا اعلان اور اصنام و اوثان کی الوہیت کا انکار کیا جاوے. یکایک سب مشتعل ہو گئے اور اس غیظ میں اس کی پرواہ نہ کی کہ اس کے بعد کیا ہو گا یک بیک عمر

(رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پر سب ٹوٹ پڑے۔ عمر بھی کچھ ایسے نہ تھے کہ بلال کی طرح پٹتے رہتے۔ انہوں نے بھی کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ اور یہ مار دھاڑ کئی گھنٹے مسلسل جاری رہی۔ کہ عاص بن وائل آگیا۔ بنی سہم کے خاندان کا یہ شخص رئیس تھا۔ نہ صرف اس کی وجاہت اس کی قوم میں تھی بلکہ دوسرے خاندانوں میں اس کی عزت ووقعت تھی۔ اور دریافت کیا کہ کیا ہنگامہ ہے لوگ سمجھتے تھے کہ "عمر" کا مسلمان ہو جانا۔ پھر اس بے باکی کے ساتھ توحید کا اعلان۔ تعددِ آلہٰہ کا انکار ایسی چیز نہیں کہ کوئی شخص کیسا ہی متین ہو مگر مشتعل ہو جاوے گا اور مارنے یا مار ڈالنے کا حکم دے دیگا۔ ہم کچھ ستا چکے ہیں۔ اس کے ساتھ پھر مار دھاڑ شروع کر دیں گے اس لئے فوراً بولے کہ عمر بد دین ہو گیا۔ عاص بن وائل نے اس خبر کو تحمل کے ساتھ سنا۔ اور کہا کہ پھر۔ تم کو کیا؟ جس طرح تم میں سے ہر ہر شخص نے اپنے لئے ایک ایک طریقہ پسند کیا اس شخص نے بھی ایک طریقہ کو پسند کیا ہے۔ تم کو کوئی حق نہیں ہے کہ اس کو مجبور کرو۔ اس کے علاوہ تم یہ بھی تو سمجھ لو کہ "عمر" بنی عدی کے خاندان سے ہیں۔ اور تم کو معلوم ہے کہ یہ خاندان کس قدر بڑا خاندان ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ اُنہوں نے کبھی ذلت برداشت ہی نہیں کی ہے۔ اگر تم نے اس شخص کو مار ڈالا تو کیا تم کو اطمینان ہے کہ بنی عدی کے افراد مکے کی گلیوں میں اپنے اور تمہارے خون سے نالیاں جاری نہ کریں گے۔ کیا تم تھوڑے سے آدمیوں کی اس حرکت کا بدلہ وہ اجتماعی طور پر خاندانوں سے نہ لیں گے۔

یہ لوگ مار پیٹ کر دل کی بھڑاس نکال چکے تھے۔ عمر کی طاقت کا موازنہ بھی کر چکے تھے۔ بنی عدی کا نام سنتے ہی گھبرا گئے اور اس خیال سے فوراً منتشر ہو گئے کہ مبادا پہچان لئے جاویں۔

**ارض حبشہ کے چند پادریوں کا اسلام:۔** حبشہ میں مکے کے نمائندوں کا جانا۔ شاہ حبشہ کے ہر ہر درباری کے گھر جانا۔ سب کو اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے ہم نوا بنانا۔ دربار میں مسلمانوں کا آنا۔ اور پوری صفائی کے ساتھ اپنے عقائد واعمال کو بیان کرنا۔ اور تمام اہل دربار کی رائے کے خلاف نمائندوں کو واپس کرنا یہ امور کچھ ایسے نہ تھے کہ آئے گئے ہو جاتے۔ حبشہ کے چپہ چپہ پر اس کا شور تھا۔ اس لئے اس سرزمین کے بیس پادریوں کی ایک جماعت فخر عالم صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی. آپ اس وقت خانہ کعبہ کے سامنے تشریف فرما تھے. کفار قریش کی ٹولیاں بھی اِدھر اُدھر مجتمع تھیں. یہ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے. اور بہت سی باتیں دریافت کیں. آپ نے سب کے اطمینان بخش جواب دیئے اس سے فراغت کے بعد آپ نے ان کو مسلمان ہو جانے کی دعوت دی. اور اسی سلسلے میں کلام الٰہی کی چند آیتیں سنائیں. قرآن سنا تو آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے. اور ایمان لائے. رخصت ہوئے تو ابوجہل سے ملاقات ہوئی. اس کے ساتھ قریش کے بعض اور سرغنے بھی تھے. سامنے آتے ہی نہ دعا نہ سلام. کہنے لگا کہ میں دعا کرتا ہوں کہ تم اپنے تمام مقاصد میں ہمیشہ ناکام رہو. کیونکہ تم کو تمہاری برادری نے جو تمہارے اہل مذہب بھی ہیں اس لئے بھیجا کہ تم حالات کا تجسس کرو. اور اس شخص کے حالات سے ان کو مطلع کرو. تم نے آتے ہی اپنا دین چھوڑ دیا. اس شخص کی باتوں میں آگئے. جو کچھ اس نے کہا تم نے اس کو مان لیا. ہم میں سے کسی نے بھی تم سے زیادہ احمق نہیں دیکھا پر دیسیوں کی یہ تھوڑی سی جماعت اس کا کیا جواب دیتی صرف یہی کہا کہ آپ لوگ اگر ہم غریب الدیار لوگوں کو ایسا کہتے ہیں تو کہیں ہمارے لئے یہ مناسب نہیں کہ جنون کا علاج جنون سے کریں یا اینٹ کا جواب پتھر سے دیں. یہ کہا اور سلام کر کے رخصت ہوگئے۔

**نبی کریمؐ کو قتل کرنے کا مشورہ:۔** دشمنانِ دینِ حق کو چین نہ تھا. انہوں نے طے کر لیا کہ اس شمعِ خداوندی کو جس طرح بھی ہو منہ کی پھونکوں سے بجھا دیا جاوے. اور اس کے لئے کسی سعی کو نہ چھوڑا جاوے خواہ اچھی ہو یا بری. بالآخر یہ طے کر لیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو علی الاعلان قتل کرایا جاوے. اگر خاندانی لوگ مطالبہ کریں گے تو بڑی سے بڑی دیت (خون بہا) ادا کر دی جاوے گی. ابوطالب کو اس سازش کی اطلاع ہو گئی تو خاندان بنی ہاشم و بنی المطلب کے تمام افراد کو جمع کیا اور بتایا کہ میں جانتا ہوں کہ تم میں سے بعض لوگ مسلمان ہو چکے ہیں اور بعض اپنے آبائی طریقے پر ہیں. لیکن موجودہ صورت حال میں اس دینی تخالف پر نظر کرنی نہیں ہے. بلکہ نصب العین یہ ہے کہ اگر مخالفین کا یہ منصوبہ پورا ہو گیا تو ہماری خاندانی عزت خاک میں مل جاوے گی. کیونکہ اول تو آج تک کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ ہم میں سے کسی پر ہاتھ اٹھاوے اور یہاں تو یہ طے ہو گیا ہے کہ علی الاعلان قتل کر دیں. گویا ہم اتنے کمزور ہیں کہ ہماری کوئی وقعت

ہی ان کے دل میں نہیں. سب نے بالاتفاق کہا کہ فی الواقع یہ تمام خاندان کی ذلت اور ناقابل برداشت ذلت ہے. چنانچہ خاندان کے تمام افراد ( خواہ مسلمان تھے یا کافر ) ایک جگہ سمٹ کر آگئے. اور آپ کی حفاظت کا پورا عہد کرلیا. ان میں سے جو مسلمان تھے وہ تو اس حفاظت اور جاں نثاری کو سرمایہ آخرت سمجھتے تھے. اور جو اس دولت سے محروم تھے وہ اپنی آبائی عزت کو اسی میں محفوظ خیال کرتے تھے کہ یہ سب کے سب ایک محفوظ جگہ میں مجتمع ہو کر رہنے لگے. اس پر بھی ابو طالب کا یہ حال کہ اول شب میں حضور نے کسی جگہ آرام فرمایا رات کا کچھ حصہ گزر جانے کے بعد ابو طالب نے آپ کو آپ کی خوابگاہ سے بیدار کیا اور اپنے بیٹوں. بھائیوں. چچازاد بھائیوں میں سے کسی کو آپ کی جگہ سلادیا. اور حضور کو وہاں پہنچادیا. غرض یہ تھی کہ مفسد اور غنڈے ہر وقت تاک میں رہتے ہیں کہ حملہ کردیں. اس لئے اگر اُن کو خبر ہوگئی کہ آپ فلاں جگہ آرام فرما رہے ہیں تو آخر شب میں اسی جگہ حملہ کردیں گے جس جگہ وہ پہلے سے معلوم کرچکے ہیں کہ حضور نے وہاں آرام فرمایا ہے اور وہ وقت پہنچانے اور جانچنے کا نہ ہوگا کہ اس جگہ سونے والے حضور ہیں یا کوئی دوسرا. اس صورت میں حضور بچ جاویں گے. میرا کوئی دوسرا عزیز بیٹا ہو یا بھائی مقتول ہوجاوے گا۔

حفاظت کے اس طرز کا حاصل یہ تھا کہ ابو طالب نے اپنی جانب سے تو اپنے بیٹے یا بھائی کو حضور پر نثار اور قربان کرہی دیا تھا. اس کے بعد بھی وہ زندہ رہے تو یہ امر آخر ہے۔

**مسلمانوں کا سماجی و معاشی بائیکاٹ.** ۔ بالجملہ جب کفار قریش نے یہ سمجھ لیا کہ اس ارادہ میں بھی ناکامی ہوئی۔ تو انہوں نے از سرنو مجتمع ہو کر مشاورت کی اور طے ہوا کہ جب یہ لوگ محمد ( صلی اللہ علیہ وسلم ) کی حمایت سے باز نہیں آتے ہیں تو ان سے قطع تعلق کرلینا ہی ضروری ہے۔ چنانچہ اس خاندان کے ہر فرد سے قطع تعلق کرلیا گیا. چنانچہ دستاویز لکھی گئی جس میں تحریر تھا کہ ہم دستخط کنندگان بیاہ شادی. اٹھنا بیٹھنا. ساتھ کھانا غرض باہمی میل جول کا کوئی تعلق محمد ( صلی اللہ علیہ وسلم ) اور ان کے حامیوں سے نہ رکھیں گے۔

اس معاہدے کی پابندی بڑی سختی سے ہوئی. پکٹنگ کی نوبت یہ تھی کہ ان گرفتارانِ بلا کو ایک دانہ ملنا ناممکن تھا۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ اس عہد کی پابندی اُن لوگوں پر ہے جو کہ مکے کے باشندہ

ہیں ؛ اُن لوگوں کو اس عہد نامہ سے کوئی تعلق نہیں ہے جو مکے سے باہر کے باشندے ہیں اور یہاں صرف اس لئے آتے ہیں کہ تاجرانہ مال کو فروخت کر کے گھروں کو واپس جاویں. اسی لئے جس وقت سنتے تھے کہ کوئی تجارتی قافلہ مکے میں آنے والا ہے. تو منتظر رہتے تھے اور قافلے کے پہنچتے ہی تمام مال تجارت اس سے خرید لیا جاتا تھا تاکہ مباداان مصیبت زدوں میں سے کسی کو تھوڑا یا بہت خرید لینے کا موقع مل جاوے۔

**بائیکاٹ ختم ہونے کے اسباب:۔** یہ مقاطعہ دو ایک دن کا نہ تھا تقریباً تین سال تک رہا. اور متعدد وجوہ کی بناء پر ختم ہوا. اس انتہا کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ حکیم بن حزام تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے سر پر رکھوا کر اس جگہ کے قریب پہنچے جس جگہ رسول خدا اور اُن کے اتباع فقر و فاقہ کی زندگی بسر کر رہے تھے. اتفاقاً ابو جہل بھی اِدھر اُدھر موجود تھا. دونوں کو روک لیا اور کہا کہ تم تمام برادری کے خلاف بنی ہاشم کو غذا پہنچاتے ہو. مجھ کو بھی تعجب تھا کہ اس فقر و فاقہ پر عرصہ دراز گزر گیا یہ لوگ زندہ کیونکر ہیں؟ آج معلوم ہوا کہ تم جیسے قوم کے غدار خفیہ خفیہ ان کو غذا پہنچاتے رہے ہیں ورنہ یہ لوگ اب تک مر چکے ہوتے یا آباؤ اجداد کا طریقہ از سر نو اختیار کرتے. میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب تک میری جان میں جان ہے. یہ غلہ تو بنی ہاشم تک پہنچنے ہی نہ دوں گا مگر تم کو ساری برادری میں ذلیل و رسوا بھی اچھی طرح کروں گا. یہ جھگڑا ہو ہی رہا تھا کہ اتفاقاً ابوالبختری آگیا اور پوچھا کہ کیا جھگڑا ہے. ابو جہل سمجھا کہ اچھا ہے ایک مدد گار ملے گا. کہنے لگا کہ ہوتا کیا؟ ان چھپے غداروں نے فتنہ کی آگ بھڑکا رکھی ہے. ہم نے چاہا تھا کہ تدبیر کے ذریعہ سے خواہ اس میں کچھ ہی کرنا پڑے ہم اس آگ کو بجھا دیں گے جس کے متعلق ہم کو خوف ہے کہ مبادا گھر گھر میں پھیل جاوے. مگر جب تک ان جیسے قوم کے بد خواہ موجود ہیں. ہماری تدبیر کامیاب ہو ہی نہیں سکتی ہے. تم کو معلوم ہے کہ ہم سب نے متفقہ طور سے ان بد دینوں سے قطع تعلق کر رکھا ہے. اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ یا تو یہ لوگ فاقوں سے مر چکے ہوتے اور یا ہمارے آباؤ اجداد کی. ہمارے اوتاروں کی توہین سے باز آجاتے. مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی. اس کی وجہ آج معلوم ہوئی کہ جماعت کے بعض غدار ان لوگوں کو خفیہ خفیہ غلہ پہنچاتے رہے ہیں. ابوالبختری نے سارا قصہ سن کر کہا کہ! تم کو معلوم

ہے کہ خدیجہ بھی انہیں میں سے ایک ہیں جن کو تم نے فاقوں سے مار دینے کا ارادہ کر لیا ہے اور وہ حکیم کی پھوپھی ہیں. یہ غلہ ان کی پھوپھی کا مملوک ہو گا ان کے پاس بطور امانت رکھا ہو گا. آج ان کو موقع مل گیا تو یہ دینے جا رہے ہیں. اور مجھ سے تو اگر سچ پوچھو تو سچ یہ ہے کہ اگر پھوپھی کو بھوک سے مرتے ہوئے دیکھنا پسند نہ کیا ہو اور اپنے پاس ہی سے لے جا رہے ہوں تب بھی قابل ملامت نہیں. خلاف توقع جواب سن کر ابو جہل کو غصہ آگیا اور کہنے لگا کہ تم بھی شریک حال معلوم ہوتے ہو. غرض یہ کہ بات بڑھی اور مار پیٹ کی نوبت بھی آئی۔

یہ واقعہ معمولی واقعہ نہ تھا. بجلی کی طرح مکے میں زبان زد ہو گیا. گھر گھر چرچا ہونے لگا لیکن عجب بات یہ تھی کہ بنی ہاشم کے ساتھ ہمدردی کی آوازیں زیادہ آنے لگی تھیں۔

اس کے بعد یہ تمام لوگ ایک جگہ جمع ہوئے. سب سے پہلے ہم آہنگی کا معاہدہ کیا. اس کے بعد اس پر بحث ہونے لگی کہ اول کون ابتداء کرے؟ زہیر نے کہا کہ سب سے پہلے میں شروع کروں گا آپ سب صاحب میری تائید کریں. بقیہ لوگوں نے اس کو منظور کر لیا۔

صبح ہوئی. کفار مکہ کی چوپال بھی خانہ کعبہ کا صحن ہی تھا. چاروں طرف ٹولیاں جمع ہو گئیں ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں. زہیر اپنے خاندان میں ذی عزت تھے. عمدہ کپڑوں میں رئیسانہ انداز سے آئے خانہ کعبہ کا طواف کیا. اور اس طرح کھڑے ہوئے کہ تمام جماعتیں ان کے سامنے تھیں. اور بآواز بلند کہا کہ اے مکہ والو! کیا یہ بھی کوئی آدمیت ہے کہ ہم لوگ سیر ہو کر کھایا کریں. عمدہ کپڑے پہنا کریں اور بنو ہاشم تباہ و برباد ہو رہے ہوں. نہ کوئی چیز خرید سکتے ہیں نہ فروخت کر سکتے ہیں. خدا کی قسم! جب تک مقاطعہ کی یہ ظالمانہ دستاویز چاک نہ کر دی جاوے گی میں یوں ہی کھڑا رہوں گا. ہرگز ہرگز نہ بیٹھوں گا۔

ابو جہل نے دیکھا کہ اس وقت مجمع زیادہ ہے. ان میں سخت دل بھی ہیں اور نرم دل بھی. مبادا ان میں سے کسی کو رحم آجاوے اور اس بنا پر کوئی ہلکا سا کلمہ کہہ دے تو پھر سب کے سب وہی کہیں گے. اس لئے فوراً بول اٹھا کہ زہیر! یہ دستاویز تو یوں ہی رہے گی اس کو کوئی شخص چاک نہیں کر سکتا ہے. اس میں قوم کی متفقہ رائے تحریر ہے. زمعہ نے کہا کہ ابو الحکم! تم اس وقت بالکل جھوٹ بول رہے ہو. ہرگز ہرگز قوم کی متفقہ رائے نہیں ہے جس وقت یہ وحشیانہ

دستاویز لکھی جارہی تھی میں تو اس وقت بھی راضی نہ تھا. پھر متفقہ کیونکر ہوئی. ابو البختری نے کہا کہ زمعہ نے سچ فرمایا. ہم اس وقت بھی اس باہمی معاہدہ کو ناپسند کرتے ہیں. اور ناقابل تسلیم خیال کرتے ہیں. ایک جانب سے مطعم کی آواز آئی کہ یہ دونوں صاحب سچ کہتے ہیں. ان دونوں کے خلاف جو شخص کہتا ہے وہ جھوٹا ہے. ہم خدا کے سامنے اس دستاویز سے اور اس سب سے جو اس دستاویز میں لکھا ہوا ہے اس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں. ہشام نے بھی اسی کے قریب قریب کہا۔

یہ پانچوں صاحب اس ترتیب سے بیٹھے تھے کہ ابو جہل کو یہ معلوم ہوا کہ چاروں طرف سے آوازیں بنی ہاشم کی موافقت میں آرہی ہیں مگر وہ ایسا نادان نہ تھا. اس نے فوراً سمجھ لیا کہ چند آدمی ہیں جو چاروں طرف پھیل کر بیٹھ گئے ہیں اس لئے اس نے کہا کہ آپ لوگوں کی یہ مخالفت رات کے مشورہ کا نتیجہ ہے. اس وقت ابو طالب بھی ایک گوشہ میں موجود تھے کہ مطعم نے بڑھ کر دستاویز کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا ارادہ کیا. معلوم ہوا کہ یہ دستاویز دیمک خوردہ ہے مگر دیمک خوردہ بھی اس عجب طریقہ پر ہے کہ دستاویز بھر میں جہاں جہاں خدا کا نام لکھا ہوا ہے وہ تو علیٰ حالہٖ باقی ہے بقیہ کو کھالیا ہے. گویا دیمک بھی درسگاہ کی تعلیم یافتہ تھی جس نے سمجھ سمجھ کر ایسے مواقع ترک کر دیئے تھے. اور قبل اس کے کہ انسانی ہاتھوں سے یہ ظلم نامہ پارہ پارہ ہو دیمک نے اس کو نیست و نابود کر دیا تھا اور اس دستاویز کا کاتب منصور بن عکرمہ تھا جس کا ہاتھ اس کے بعد شل ہو گیا تھا۔

**قریش نے آپ کی نبوت کی مخالفت کیوں کی ؟** ۔ کفار قریش کی مخالفت کے نمونے دیکھ لئے۔ اس کے بعد اس کہنے میں کیا غلطی ہے کہ خدا کے ایک برگزیدہ رسول کے مقابلہ میں ان غیر محدود اشرار نے سر دھڑ کی بازی لگادی تھی. ان کا مطمح نظر یہی تھا کہ آپ دنیا سے رخصت ہو جاویں. پھر خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو. ان تکالیف کی وجہ سے آپ نے اپنا آبائی وطن ترک کیا مدینہ تشریف لے گئے. اور وہاں سے فاتحانہ طریقہ پر مکے میں داخل ہوئے ظاہر ہے کہ اسلام کا غلبہ اس صورت میں بھی ہو سکتا تھا کہ جس طرح اہل مدینہ نے آپ کا ساتھ دیا جو کہ قرابت کے اعتبار سے اجنبی تھے اور ان کی معیت اور تائید فتح مکہ کا سبب بنی. اسی طرح اس سے زیادہ عمدہ صورت

یہ تھی کہ آپ کے ساتھ اہل مکہ ہوتے اور آپ اہل مکہ کی معیت میں مدینہ کو فتح کرتے. پھر اقارب کے ہاتھ سے ایذائیں پہنچانے. اور اغیار کے ذریعہ سے امداد کرانے میں کیا خوبی تھی۔

نضلہ بنی لوی کے خاندان کا ایک شخص تھا اس مقاطعہ سے پہلے بنی ہاشم کا بچہ بچہ اس سے واقف تھا. اور یہ ان کے ہر دکھ اور درد میں شریک بھی رہتا تھا. اس مقاطعہ کے زمانہ میں اگرچہ کھلم کھلا اعانت ناممکن تھی مگر کئی دفعہ غذا کی کافی مقدار بنی ہاشم کے پاس پہنچا دینے کا مجرم تھا۔

اس قصہ کے بعد ہی زہیر کے پاس گیا. زہیر کی ماں مسماۃ عاتکہ عبدالمطلب کی بیٹی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں. اور کہا کہ زہیر! کیا تم کو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تم اور تمہارے گھر والے تو سیر ہو کر کھانا کھایا کریں. عمدہ عمدہ کپڑے پہنیں. شادی اور بیاہ کریں. مگر تمہارے ماموں کے خاندان کے لوگ اس بد تر حالت میں رہیں جس سے تم بھی ناواقف نہیں ہو. نہ کوئی ان کے ہاتھ کچھ فروخت کر سکتا ہے. نہ ان سے کوئی شخص خرید سکتا ہے نہ وہ شادی بیاہ کر سکتے ہیں. آخر ہمارے اندر یہ بے رحمی کیونکر آ گئی ہے۔ سنو! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر یہی حال ابو الحکم (ابو جہل) کے ماموؤں کا ہوتا اور انہوں نے کوئی جدید چیز گڑھ لی ہوتی اور تم مقاطعہ کی تجویز کرتے تو ابو الحکم ہرگز ہرگز نہ مانتا. زہیر نے کہا کہ ہشام! تم بالکل ٹھیک کہتے ہو. ابو الحکم کو تو خواہ مخواہ ان لوگوں سے عداوت ہو گئی ہے. لیکن مجھ کو ملامت کرنے سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ جب کہ مکے کی اکثریت اس مقاطعہ میں شریک ہے تو میں ایک سورما چنا بن کر بھاڑ کو کس طرح پھوڑ دوں. خدا کی قسم! اگر میرے ساتھ ایک آدمی بھی اور ہوتا تو یہ عہد نامہ اب تک ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہوتا. ہشام نے کہا کہ اگر ان وحشیانہ حرکات کا انسداد اس پر موقوف ہے کہ ایک آدمی اور ساتھ دے تو ایک آدمی بھی موجود ہے. زہیر نے کہا کہ وہ کون ہے؟ ہشام نے کہا کہ میں ہوں. زبیر بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ ہشام صرف دو آدمیوں سے کار برآری دشوار ہے. اگر ایک اور ہوتا تو بہت آسانی ہوتی. ہشام نے کہا کہ یہ بھی ممکن ہے. یہ کہہ کر مطعم بن عدی کے پاس پہنچا. اور اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد کہا کہ مطعم! کیا تم کو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ بنی عبد مناف کے دو بڑے بڑے خاندان دنیا سے ناپید ہو جاویں اور تمہاری نظروں کے سامنے فنا ہوں. مگر تم ان ظالموں کا ساتھ نہ چھوڑو. خدا کی قسم! اگر تم نے اسی طرح ان ظالموں

کو من مانی کارروائیاں کروائیں تو یہ لوگ ان دونوں خاندانوں کو بہت جلد تباہ اور برباد کر دیں گے۔ مطعم نے کہا کہ ہشام! میرا دل بھی اس بے رحمی پر مجھ کو ملامت کرتا ہے مگر خود بھی تو انصاف کرو کہ میں اکیلا تمام مکے والوں کا مقابلہ کیونکر کر سکتا ہوں. اگر اس بارے میں کوئی ایک آدمی بھی ہم خیال ملجاتا تو تم دیکھتے کہ میں کیا کرتا. ہشام نے کہا کہ اگر تمہاری ہمدردی اور انسانیت اس قدر کمزور ہے کہ اس کے لئے ایک مددگار کی ضرورت ہے تو میں اس کو بھی بتا سکتا ہوں. مطعم نے تعجب سے دریافت کیا کہ کون؟ ہشام نے کہا کہ میں ہوں. مطعم نے کہا کہ بس ٹھیک ہے. لیکن اگر ایک اور بھی ہوتا تو پوری تقویت ہوتی. ہشام نے کہا کہ ایک اور بھی ہے. مطعم نے کہا کون؟ ہشام نے کہا کہ زبیر. مطعم نے کہا کہ عقل کی بات یہ ہے کہ ایک اور بھی ہونا چاہئے. ہشام نے کہا کہ اچھا. یہ کہہ کر وہاں سے رخصت ہوا اور ابی البختری کے پاس پہنچا. اور وہی کہا جو زبیر اور مطعم سے کہا تھا. ابوالبختری نے کہا کہ ان خیالات میں تمہارا ساتھی کوئی اور بھی ہے؟ ہشام نے کہا کہ تین آدمی اور ہیں. پہلا میں. دوسرا مطعم. تیسرا زبیر. ابوالبختری نے کہا کہ تعداد تو کافی ہے مگر ایک آدمی اور بھی ہوتا تو اچھا تھا. ہشام نے کہا کہ اچھا. اور زمعہ کے پاس گیا. بات چیت کرنے کے بعد کہا کہ بنی عبد مناف کے دو خاندان عرصہ سے ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں کہ اُس زندگی سے موت اچھی ہے. تمہاری ان سے کچھ قرابت بھی ہے. ان کے کچھ حقوق بھی تم پر ہیں. زمعہ نے بھی تائید کی اور کہا کہ ایسے بڑے معاملے میں میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں جس میں ایک ایک بچہ بھی شریک ہے. جس کام کو جماعت نے کیا ہے اُس کام کو جماعت ہی توڑ سکتی ہے. ہشام نے نام بتا کر کہا کہ یہ لوگ بھی ہم خیال ہیں۔

اس کے جواب کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ عرب کے رسم و رواج پر نظر کی جاوے تاکہ جواب پیش کرنے میں سہولت ہو۔

عرب میں باہمی حمیت پوری قوت کے ساتھ تھی. خاندان کے کسی فرد کی زبان سے کوئی بات نکلتی تھی اُس کی حمایت ہر ہر شخص کرتا تھا. خواہ زبان سے نکلی ہوئی بات صحیح ہو یا غلط. اسی طرح اگر کسی سے کوئی غلط کاری ہو جاتی تھی تو خاندان کے لوگ غلط کاری کی بھی حمایت کرتے تھے. اور غلط کاری کرنے والے پر کسی طرح کی آنچ نہ آنے دیتے تھے اور اسی وجہ سے فریق مخالف بھی غلط کاری کرنے والے کے خاندان میں سے ہر ہر شخص سے انتقام لینا چاہتا ۔

مختصر یہ ہے کہ جنبہ داری ان کی فطرت میں داخل اور گھٹی میں شامل تھی. اسی لئے کشتوں کے پُشتے لگ جانے کے باوجود یہ نہ کہا جاسکتا تھا کہ کون سی جماعت حق پر تھی. کیونکر حمایت بے جا کا احتمال دونوں طرف ہوتا تھا۔

اب اگر دعویٰ نبوت پر اہلِ مکّہ لبّیک کہتے. مخالفت نہ کرتے بلکہ ساتھ دیتے. مخالفت کرنے والوں کا مقابلہ کرتے تو معاندین اسلام کو یہ کہنے کی گنجائش ہوتی کہ اسلام الٰہی دین نہ تھا. عرب کے ایک شخص نے ایک دعویٰ کیا. خاندانی رسم و رواج کے موافق اپنوں نے ساتھ دیا. اپنی اجتماعی قوت سے دوسروں کو مغلوب کیا. لیکن اب کہ اسلام کو اوّلاً ان لوگوں نے قبول کیا جو اجنبی تھے. رشتے دار نہ تھے. اور جانتے تھے کہ اس حلقہ بگوشی میں مضرات کے علاوہ کوئی نفع ذرہ برابر بھی بالفعل نہیں ہے. اس کی حمایت اور جاں نثاری میں اپنے آپ کو خطرات ہی میں مبتلا کرنا ہے پھر یہ بھی کہ اس کو قبول ہی نہ کیا بلکہ جو کچھ کہا تھا اس کو پورا کیا. اپنی جانیں گنوائیں. دشمنوں کی جانیں لیں مگر اسلام کی دولت ہاتھ سے جانے نہ دی. آپ کے ساتھ ہو کر آپ کے اقارب کا مقابلہ کیا اور ان پر فتح حاصل کی. اگر غور کیا جاوے تو یہ ایک مستقل دلیل صداقت اسلام کی ہے. اور عجب نہیں کہ احکم الحاکمین کی حکمت بالغہ نے اس طرز میں علاوہ اور رموز کے یہ حکمت بھی رکھی ہو۔

**طفیل بن عمرو دوسی کا اسلام:۔** قبائل عرب میں قبیلہ دوس ایک ممتاز خاندان ہے. اس خاندان کے ایک سربرآوردہ شخص طفیل بن عمرو نامی تھے. جو نہ صرف اپنی قوم میں وجاہت رکھتے تھے بلکہ بہادر بھی تھے. اور عرب کے خوش بیان مقرروں میں ان کا نام بھی شمار کیا جاتا تھا. اتفاقاً مکے میں آگئے تو مختلف قسم کے لوگ ان کے پاس عَلَی التّوالی و التّعاقب (یعنی یکے بعد دیگرے) آتے رہے. اور سب کا ایک ہی مقصد تھا کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر بدظن کر دیا جاوے کہ یہ نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنیں نہ آپ کی زیارت سے مشرف ہوں۔

یہ تدبیر کارگر ہوئی. اور مختلف پہلوؤں سے. کثیر التعداد اشخاص سے برائیاں سن کر طفیل کے دل میں آپ سے قدر نفرت پیدا ہوگئی کہ زبان سے بالآخر نکل ہی گیا کہ اس شخص سے تو ملنا بھی

مناسب نہیں ہے اہل مکہ اپنی کوشش میں اس کامیابی کو دیکھ کر پھولے نہ سمائے۔

رسم ورواج کے موافق طفیل بن عمرو کو خانہ کعبہ کا طواف کرنا ضروری تھا. وہاں پہنچے تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول ہیں. بہت زیادہ کوشش کی کہ دور دور رہیں مگر از دحام کی وجہ سے تدبیر کار گر نہ ہوئی. بلکہ ایسی صورت آن پڑی کہ کچھ دیر تک آپ ہی کے پاس کھڑا ہونا پڑا۔

اب مجبور تھے کہ صورت دیکھیں اس لئے آنکھیں نیچی کرلیں. بات نہ سننے کا انتظام پہلے ہی سے کر کے آگئے تھے کہ کانوں میں روئی بھرلی تھی۔

دونوں ارادے غلط ہو چکے تھے. زیارت سے بھی مشرف ہوئے اور بوجہ قرب کے کانوں میں روئی ہونے کے باوجود کلام الٰہی کے کچھ نہ کچھ الفاظ بھی کان میں پڑے. ان الفاظ کی لذت کچھ ایسی محسوس ہوئی کہ زیادہ سے زیادہ سننے کو چاہا اور خیال آیا کہ مجھ پر کسی شخص کا مصنوعی کلام کیا اثر کر سکتا ہے. میں تو خود جب تقریر کرتا ہوں تو سامعین پر مجھ کو پورا اختیار ہوتا ہے کہ چاہوں رُلا دوں یا ہنسا دوں اس لئے مجھ کو چاہئے کہ میں ان کی بات سن لوں اچھے برے کا امتیاز میرے لئے کوئی دشوار کام نہیں ہے، مگر خانہ کعبہ کے پاس تو کچھ کہہ نہ سکے. کیونکہ ہجوم تھا. بات کرتے ہوئے دیکھ کر لوگوں کو شک ہوتا. اس لئے یہاں سے فارغ ہو کر درِ دولت پر حاضر ہوئے اور کہا کہ محمد! اس دفعہ میں مکّے پہنچا تو تمہاری برائیاں، ہر قسم کے لوگوں سے سنیں، بار بار سنیں، کہ میرے لئے یہ ممکن نہ ہوا کہ ان کی بات کو غلط قرار دوں بالآخر تمہاری طرف سے میرا دل بھر گیا اور ارادہ کرلیا کہ نہ تمہاری صورت دیکھوں نہ تمہاری بات سنوں، خانہ کعبہ کا طواف کرنا ضروری تھا تو میں نے ایسا وقت سوچا کہ میرے خیال میں وہ وقت تمہارے آرام کا ہونا چاہئے تھا. کانوں میں روئی بھرلی. اور خیال کرلیا کہ اگر بالفرض تم خانہ کعبہ کے ہجوم میں مل بھی گئے تو نظریں نیچی کرلوں گا. اب اگرچہ کوئی بات پوری نہ سنی، مگر تمہارے کلام میں شیرینی کچھ ایسی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ میں تمہاری بات سنوں اور غور کروں کہ تمہاری بات کی غرض کیا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام الٰہی کی کچھ آیات سنائیں تو فرماتے ہیں کہ میں نے اس کلام سے اچھا کلام نہیں سنا، چنانچہ اُسی وقت مسلمان ہوئے، گھر پہنچے تو ان کی وجہ سے ان کے والدین ان کی بی بی غرض کہ پورا خاندان مسلمان ہوا۔

کلام الٰہی کی قوت تاثیر کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک مخالف کے دل میں بھی اثر کیا. اور مخالف بھی وہ کہ جس کا دل آپ کی عداوت اور نفرت سے پُر تھا۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد کی وبا پھیلی اور صدیق اکبر نے اس کو پوری قوت سے روکا اس وقت یہی طفیل اپنے بیٹے عمرو کے ساتھ یمامہ کی جنگ میں بھی شریک تھے۔

اس جنگ میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ طفیل نے یمامہ کے راستہ میں خواب دیکھا. صبح کو اٹھ کر دوستوں کو جمع کیا اور کہا کہ میرا خواب سنو. میں نے خواب میں دیکھا کہ میرا سر مونڈ دیا گیا ہے، اور میرے منہ میں سے ایک پرندہ نکل کر اڑ گیا ہے. پھر مجھ کو ایک عورت ملی اس نے اپنی شرمگاہ میں مجھ کو رکھ لیا، اور یہ بھی دیکھا کہ میرا بیٹا میرے پیچھے تیزی سے دوڑ رہا ہے. مگر میرے ساتھ نہ ہو سکا. روک دیا گیا. سننے والوں نے کہا کہ اس کی تعبیر تو سمجھ میں نہ آئی مگر یہ ضرور معلوم ہوا کہ اچھا خواب ہے، اس سے کوئی پریشانی کی بات ظاہر نہیں ہوتی ہے، طفیل نے کہا کہ اس کی مفصل تعبیر میری سمجھ میں آگئی ہے. بتاؤں سر مونڈنے کا مطلب تو ظاہر ہے کہ میرا سر تن سے جدا کر دیا جاویگا. اور وہ پرندہ جو میرے منہ سے نکل کر اڑ گیا ہے میری روح ہے. جو عنقریب بدن سے مفارقت اختیار کریگی. اور وہ عورت جس نے اپنی شرمگاہ میں مجھ کو رکھ لیا ہے زمین ہے کہ میرے لئے قبر کھودی جاوے گی. اور میں اس میں داب دیا جاؤں گا. اس کے بعد میرا بیٹا پوری کوشش کرے گا کہ میری سی شہادت اس کو بھی نصیب ہو۔

چنانچہ یہی ہوا کہ طفیل تو جنگ یمامہ میں شہید ہوئے اور بیٹا سخت مجروح ہوا. اور بعد صحت جنگ یرموک (بزمانہ فاروق اعظم) میں شہادت سے مشرف ہوا۔

**لیلۃُ الْاَسْراء یا معراج:**۔ واقعات کے اس سلسلے میں اہم ترین واقعہ معراج کا ہے. جس کا خلاصہ یوں ہو سکتا ہے کہ آپ بہت تھوڑے سے وقت میں جس کا اندازہ منٹوں اور سکنڈوں سے کیا جاسکتا ہے مسجد حرام سے بیت المقدس اور بیت المقدس سے آسمان پر تشریف لے گئے اور ملکوت السموات کی سیر کی اور واپس آگئے۔ اس کی تفصیل اگرچہ ہمارے موضوع سے زیادہ تعلق نہیں رکھتی ہے، مگر چونکہ اس واقعہ کے ذریعہ سے بھی مسلمانوں کو اسلام سے روکا گیا. اس

لئے ہم کو اس میں چند باتیں عرض کر دینی ضروری ہیں۔

اس میں اختلاف ہوا کہ یہ سیاحت اس جسم خاکی کے ساتھ ہوئی تھی یا واقعہ خواب ہے. ایک جماعت نے تو اس کے متعلق صاف کہہ دیا کہ یہ خواب ہے. اور اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ ایک سونے والا خواب میں ہر قسم کے امور دیکھ لیتا ہے بلکہ بعض مرتبہ تو اس قدر متأثر ہوتا ہے کہ خواب میں اذیت کا احساس کر کے چیخنے لگتا ہے۔ یا راحت محسوس کر کے اپنے آپ کو سلطان ہفت اقلیم تصور کرتا ہے. اس سے زیادہ کہ کبھی کبھی تو آنکھ کھل جانے کے بعد بھی انہیں اذیتوں سے مُتألم اور راحتوں سے مسرور سمجھتا ہے جو اُس کو خواب میں پیش آچکی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد جب ہوش و حواس درست ہوتے ہیں تو سمجھتا ہے کہ اصلیت کیا تھی یہی حال اس معراج کا بھی تھا. بہت سے بہت اگر فرق کیا جاسکتا ہے تو نبی اور غیر نبی کے خواب کا۔

**معراج کو خواب کہنے کی وجہ:۔** معراج کو خواب کہہ دینے کی لِمّ ایمان کا ضعف ہے یا فلسفہ اور سائنس سے مرعوبیت کا شاخسانہ. کسی نے کہہ دیا کہ فلک اعتباری اور وہمی چیز ہے تو قرآن کی ان آیتوں میں تحریف شروع کر دی جن سے آسمان کا وجود حقیقی اور ویسا ہی ثابت ہوتا ہے جیسے کہ اور حقیقی اشیاء کا اور اگر خیال آگیا کہ قاصِرالعقل حکماء کی جماعت نے فلک میں خرق والتیام کو ممنوع قرار دیا ہے تو ملائکۃ اللہ کے ہُبوط و صُعود کا بھی انکار کیا جانے لگا. گویا ان مدعیان عقل کی ہزاروں غلطیوں اور خطاؤں کے باوجود ان امور میں ایسی قطعیت ہے کہ خدا اور خدا کے رسول کے کلام اور خبر میں تو شبہات پیدا کئے جاسکتے ہیں. اُن کے اُن معانی کو توڑا اور مروڑا جاسکتا ہے. جو سلف صالحین سے منقول یا خود سرور عالم سے مروی ہیں لیکن ان کے خیالات میں غلطی یا تاویل کا امکان نہیں ہے۔

؎ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

ضعفِ ایمان ہو یا ملاحدہ اور فلاسفہ سے مرعوبیت یا کوئی اور سبب ہو جب دل میں یہ امر راسخ ہو گیا کہ معراج کی خبریں اس نظریہ کے ماتحت ماننی ضروری ہیں کہ فلک کی جانب صعود و ہبوط ہو سکتا ہے نہ اس میں خُرق والتیام ہے نہ جسم خاکی اس پرواز کا متحمل ہے. تو اس قسم کی تاویلوں سے چارہ ہی

معراج کے متعلق خرق والتیام کی ممانعت پر بحث شائد زیادہ مفید نہ ہو. کیونکہ اس کے غوامض سمجھنا عوام کے لئے آسان نہیں پھر جس جگہ اس مسئلے پر بحث کی جاتی ہے وہاں یہی مدعیان عقل ان دلائل کو اس طرح باطل کرتے ہیں کہ حیرت کی انتہا نہیں رہتی ہے اور ایک انصاف پسند کم از کم اس نتیجے پر ضرور پہنچ جاتا ہے کہ اس کی ممانعت پر کوئی ضعیف سے ضعیف دلیل بھی جو گرزودگد سے سالم ہو، موجود نہیں ہے یہ امر آخر ہے کہ اس ضعف کے باوجود جب اس قاعدے پر کسی دوسرے دعویٰ کی بنیاد رکھیں گے تو اس کو اس طرح استعمال کریں گے کہ گویا اس کی ممانعت قطعی الثبوت ہے۔

یہ تیز رفتاری ممکن ہے: ۔ رہی یہ بات کہ عالم ملکوت کی سیر ذرا سی دیر میں کیونکر ہو گئی اس لئے یہ واقعات خواب کے ہیں زیادہ قابل توجہ نہیں، کیونکہ اول تو کسی قوی یا ضعیف دلیل سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ سرعت سیر کا منتہا کیا ہے؟ چیونٹی کو دیکھتے رہے تو معلوم ہوا کہ رفتار کی سرعت یہی ہے، پھر اپنے آپ کو چلتے پھرتے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس سے زیادہ بھی رفتار کی سرعت ممکن ہے، پھر سائیکل کو دیکھا، موٹروں اور کاروں کو دیکھا، ریل کو دیکھا اس میں پسنجر کو دیکھا، ایکسپریس کو دیکھا، میل کو دیکھا تو ان کی رفتاریں قابل حیرت طریقے پر سریع معلوم ہوئیں، مگر ہوائی جہاز کو پرواز کرتے ہوئے دیکھا تو ان سب سے زیادہ اُس کی رفتار سریع تھی، اور ایجادات کی ابھی انتہا نہیں ہوئی ہے، ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ کوئی چیز سرعت رفتار میں پیدا ہو جاوے۔

مگر ہم کو ایک ایسی نشانی دیکھنی اور دکھانی ہے جو روزانہ ہمارے مشاہدے میں آکر قادر مطلق کی قدرت مطلقہ کا یقین دلاتی ہے اور زبان حال سے کہتی ہے کہ وہ خدا ہی کیا جو قدرت کاملہ نہ رکھتا ہو۔

ہم مشرق کے افق پر روزانہ صبح کو آفتاب کو نکلتے دیکھتے ہیں، اہل ہیئت کے نزدیک آفتاب زمین سے ایک سو ساٹھ گنا سے زیادہ بڑا ہے اس صورت میں اس کا بالائی نقطہ. نقطہ زیریں سے لاکھوں میل دور ہے لیکن آپ غور سے دیکھیں تو معلوم ہو جاوے گا کہ ابھی آفتاب نے افق سے سر نکالا کہ اُس کا بالائی نقطہ اوپر تھا پلک جھپکنے کی مقدار میں اُس کا زیریں نقطہ اُسی جگہ آگیا جس جگہ نقطہ بالائی تھا. یعنی زیریں نقطہ نے یہ بڑی مسافت تقریباً چھ سیکنڈ کی مقدار میں

طے کی اور اسی طرح اُس کا بالائی نقطہ ذرا سی دیر میں اتنا ہی اونچا ہو گیا. تو جب ہم روزانہ اس سرعت رفتار کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں تو نہ معلوم اُس وقت کیا ہو جاتا ہے جب کہ ہمارے سامنے مخبر صادق کے بیان فرمائے ہوئے واقعات آتے ہیں۔

**معراج کو روحانی ماننے والوں کے دلائل :۔** ان حضرات نے نصوص سے بھی استدلال فرمایا ہے۔

(اول) قرآن شریف میں اس کو رؤیا قرار دیا گیا ہے اور سب جانتے ہیں کہ رؤیا عربی میں خواب کو کہتے ہیں.

(ثانی) حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ :۔

**مَا فُقِدَ جَسَدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَسْرٰى بِرُوْحِهٖ (بدایہ ص ۱۱۲ ج ۳)**

(ثالث) حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جب معراج نبوی کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے تو فرماتے ہیں کہ معراج حضور کے لئے خدا کی طرف سے سچا خواب تھی۔

(رابع) شریک نے بروایت انس رضی اللہ عنہ کہا ہے کہ **ثُمَّ اسْتَيْقَظْتُ فَاِذَا اَنَا فِي الْحِجْرِ** (آسمانی سیاحت سے فارغ ہو کر میں بیدار ہوا تو میں نے اپنے آپکو حطیم میں موجود پایا)

**معراج جسمانی کے دلائل :۔** لیکن کلام الٰہی میں اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے آیت کو لفظ "سُبْحَانَ" سے شروع کیا گیا ہے. اور تسبیح کے ساتھ ساتھ قرآن میں جس قدر واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ وہی ہیں جو عظیم الشان اور غیر معمولی ہیں. یعنی حق تعالیٰ نے جس اہتمام کے ساتھ معراج کو بیان فرمایا ہے اس سے اس کا عجیب ہونا معلوم ہوتا ہے اگر یہ واقعہ بحالت خواب ہوتا یا روحانی طور پر ہوتا تو اس میں کوئی قابل تعجب بات ہی نہ تھی. تقریباً ہر شخص نے خواب میں غیر ممکن امور دیکھے ہوں گے۔

پھر اس آیت میں "بِعَبْدِہٖ" کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے. متبادر معنی عبد کے روح مع الجسد کے ہیں. کیونکہ جَاءَنِیْ عَبْدُ فُلَانٍ کے معنی یہی ہے کہ وہ بیداری میں آیا اور بدن روح دونوں کے ساتھ آیا. عبد کا مصداق مجموعہ روح اور جسد ہوتا ہے. اور اس کے ساتھ جو فعل منسوب کیا جاوے وہ بیداری ہی میں ہو سکتا ہے۔ (اِذَا لَمْ تَقُمْ قَرِیْنَۃٌ عَلٰی خِلَافِہٖ. یعنی اگر اس کے خلاف کوئی اشارہ نہ ہو)

اگر معراج بحالتِ خواب ہوتی یا روحانی طور پر ہوتی تو اس واقعہ کو سن کر مسلمانوں میں سے بعض ضعیف الاسلام مرتد نہ ہو جاتے۔ بدایہ ص ۱۱۰ میں ہے:۔

**ثُمَّ انْصَرَفَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی مَکَّۃَ فَاَصْبَحَ یُخْبِرُ قُرَیْشًا بِذٰلِکَ فَذُکِرَ اَنَّہٗ کَذَّبَہٗ اَکْثَرُ النَّاسِ وَارْتَدَّتْ طَائِفَۃٌ بَعْدَ اِسْلَامِھَا.**

ترجمہ:۔ آسمانی سیاحت کے بعد آپ مکہ واپس تشریف لائے اور صبح کو اس کی خبر قریش کو دی تو اکثر لوگوں نے اس کو جھٹلایا اور ایک جماعت جو مسلمان ہو چکی تھی اس کو سن کر مرتد ہو گئی۔

کیونکہ خواب میں اس قسم کے واقعات پیش آتے ہی ہیں۔

صدیق اکبر اپنے اخلاق اور حسن سلوک کی وجہ اہل مکہ میں محبوب تھے. اور ان کا مسلمان ہو جانا کفار قریش پر بہت گراں تھا. وہ چاہتے تھے کہ صدیق اکبر کسی طرح اسلام کو ترک کر دیں۔

اسی لئے جب معراج کا قصہ سنا تو یقین کر لیا گیا کہ صدیق اکبر بھی اس کی تصدیق نہ کریں گے. اور اسلام چھوڑ دیں گے. ایک جماعت آپ کی خدمت میں پہنچی اور کہا کہ تمہارے نبی یہ فرمار ہے ہیں. اب تو ان کا ساتھ چھوڑ دو. صدیق اکبر نے جو جواب دیا ہے وہ سونے کے حروف میں لکھے جانے کے قابل اور اس لائق ہے کہ ہر مسلمان اس کو اپنا نصب العین بنا دے۔ فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ تم غلط کہہ رہے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے. لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ آپ نے ایسا فرمایا ہے تو میں صاف کہتا ہوں کہ وہ سچے ہیں یوں ہی ہوا ہو گا۔

**وَطَارَ الْخَبَرُ بِمَکَّۃَ وَ جَاءَ النَّاسُ اِلٰی اَبِیْ بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فَاَخْبَرُوْہُ اَنَّ مُحَمَّدًا (صَلَّی اللّٰہُ**

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) يَقُوْلُ كَذَا وَكَذَا فَقَالَ اِنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ عَلَيْهِ. فَقَالُوْا وَاللهِ اَنَّهٗ لَيَقُوْلُهٗ. فَقَالَ اِنْ كَانَ قَالَهٗ فَلَقَدْ صَدَقَ

ترجمہ:۔ یہ خبر مکہ میں پھیل گئی. اور مخالفین حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسا اور ایسا کہتے ہیں. تو فرمایا کہ تم لوگ اُن پر افترا کرتے ہو. اُنھوں نے قسم کھائی تو فرمایا کہ اگر اُنھوں نے فرمایا تو بالکل سچ کہا۔

اگر یہ خواب تھی تو (۱) مکہ میں غیر معمولی طور پر کیوں پھیلی. شہرت تو غیر معمولی چیز کی ہوتی ہے. (۲) کفار قریش اس طمع میں صدیق اکبر کے پاس کیوں آئے کہ آج ان کو بھی اس واقعہ کی خبر سے اسلام کو ترک کرنا پڑیگا (۳) صدیق اکبر نے ان سے کیوں فرمایا کہ تم جھوٹ بولتے ہو. اُنھوں نے ایسا ہرگز ہرگز نہ فرمایا ہو گا. خواب کی خبر ایسی کیوں تھی. کہ صدیق اکبر نے بھی اُس کو اُن سے باور نہ کیا (۴) جب کفار قریش نے قسم کھائی تب بھی یقین نہ کیا اور اور شک ظاہر کرنے والے الفاظ میں فرمایا ہے کہ اگر اُنھوں نے فرمایا ہے تو سچ ہے. گویا یہ خبر ایسی غیر معمولی تھی کہ قسم کے بعد بھی یقین نہ آیا۔ آپ صبح کو مسجد حرام میں تشریف لائے آپ رات کے واقعات ماضیہ پر غور کرنے میں مصروف تھے کہ ابو جہل آیا. اور بطور چھیڑنے کے کہا کہ آج کیا کوئی نئی بات ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں ہے تو. کہا کہ کیا؟ فرمایا کہ آج شب میں مجھ کو بیت المقدس تک لیجایا گیا. ابو جہل ششدر رہو کر رہ گیا اور کہنے لگا کہ رات میں اور بیت المقدس تک؟ فرمایا کہ ہاں، کہنے لگا کہ یہ بات تو اس قابل ہے کہ سب کو سنائی جاوے. اگر میں لوگوں کو جمع کر لوں تو آپ ان سب کے سامنے بیان کر دیں گے. فرمایا کہ ہاں. ابو جہل نے تو اس خیال سے سب کو جمع کیا کہ اچھا ہو گا سب مل کر مذاق کریں گے ان کا (معاذ اللہ) جھوٹ سب پر ظاہر ہو گا اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے غالبًا یہ خیال فرمایا کہ اچھا ہو گا سب کو ایک ہی دفعہ تبلیغ ہو جاوے گی۔

چنانچہ ابو جہل نے پوری سرگرمی کے ساتھ سب کو مطلع کیا، کفار قریش بھی اس سے ناواقف نہ تھے کہ ابو جہل روزانہ آپ کے ساتھ ایک دلچسپ اور پُر مذاق بات کیا کرتا ہے. سب کو بلانے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کوئی محمد کا سوانگ ہو گا جس کو بلانے کی اطلاع ملتی تھی صرف وہی نہ آتا تھا بلکہ جس قدر اُس کو مل سکتے تھے سب کو ساتھ لاتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں سب جمع ہو گئے.

ابو جہل نے بہت نرمی کے ساتھ کہا کہ میں تو سن چکا ہوں، ذرا ان سب کو بھی رات کی سیر کا قصہ سنا دو۔ آپ نے از اوّل تا آخر سب بتا دیا۔

یہ واقعہ سننا تھا کہ مجمع سے گویا عقل سلب ہو گئی کوئی تالیاں بجا بجا کر اچھلتا تھا کوئی سیٹی بجا رہا تھا اور اس سے سب کی ایک ہی غرض تھی کہ آپ کی تکذیب کی جاوے اور نیز یہ کہ واقعہ خارج از عقل ہے انصاف کرو کہ کیا خواب پر اس قدر بڑا فتنہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آپ نے اس جسد کی ارضی و سماوی سیاحت کو تھوڑے سے وقت میں بیان فرمایا ہو۔

صرف یہی نہیں بلکہ سوالات پر سوالات کئے گئے کہ ہم تم کو خوب جانتے ہیں ہم کو معلوم ہے کہ تم کبھی بیت المقدس نہیں گئے ہو۔ وہاں کے حالات سے واقف نہیں ہو بیت المقدس کے حالات وہاں کی علامات بلکہ بیت المقدس کے راستے سے ہمارا فلاں قافلہ گزر رہا ہے اس کی کیفیت بھی بیان کرو۔

خواب ہونے کی صورت میں یا روحانی ہونے کی کیفیت میں نہ وہ پوچھ سکتے تھے۔ نہ آپ کو جواب میں خلجان ہوتا کہ میں نے بیداری میں کب دیکھا ہے جو تم مجھ سے دریافت کرتے ہو۔ نہ بیت المقدس کی کیفیت بیان کرنے کی فکر میں پڑتے۔ حتیٰ کہ صحیح مسلم شریف میں ہے کہ بیت المقدس کو خداوند عالم نے آپ پر منکشف کر دیا۔ اور اس طرح بیت المقدس کے متعلق ان کے تمام سوالوں کا جواب دیا۔

معراج کی ساری روئداد بصراحت بتاتی ہے کہ یہ نہ روحانی تھی نہ خواب۔ یہ سب کچھ بحالت بیداری اور اسی عنصری جسد کے ساتھ تھا۔

**روحانی معراج کے دلائل کا جواب:۔** اب رہے ان حضرات کے دلائل۔ سوان کے متعلق یہ عرض ہے کہ

(اول) یہ رؤیا (خواب) واقعہ معراج کا ہے یا عمرۂ مکہ کا جس کو لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّؤْیَا۔ الخ (یعنی تحقیق اللہ نے اپنے رسول کو خواب سچ دکھایا ــ الفتح : ۲۷)

یا غزوہ بدر کا ہے جس کو اِذْ یُرِیْکَھُمُ اللّٰہُ فِیْ مَنَامِکَ الخ۔ (یعنی جب اللہ نے وہ کافر آپ کو آپ کے خواب میں دکھلائے۔ الانفال: ۴۳) میں فرمایا گیا ہے۔

اور اگر علے سبیل ارْخاءِ العنان اس کو واقعہ معراج ہی سے متعلق مان لیا جاوے تو رؤیا کو بمعنی رؤیت ( آنکھ سے دیکھنا ) کہا جاسکتا ہے کیونکہ دونوں (ر۔ ء۔ ی) سے بنے ہیں، جیسے قربیٰ اور قرابت۔ اور بعض حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ عموماً شب کے مشاہدات کو رؤیا کہہ دیا جاتا ہے خواہ یہ مشاہدہ بحالت بیداری ہو یا بحالت خواب۔

( ثانی ) و ( ثالث ) :۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا تو اس وقت آپ کے نکاح میں نہ آئی تھیں کیونکہ آپ حضور کے نکاح میں مدینہ کے قیام کے زمانہ میں آئی ہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس وقت تک مشرف باسلام نہ ہوئے۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ کہا جاسکتا ہے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ کسی دوسرے شخص سے سن کر فرمادیا ہے یا اپنے قیاس واجتہاد سے فرمادیا ہے. یا ان کے فرمانے کا تعلق کسی دوسرے واقعہ سے ہے. احتمالات مذکورہ کے ہوتے ہوئے تمام شواہد و نصوص کے خلاف ان کے اقوال کو تسلیم کرنا دشوار ہے۔

( رابع ) شریک محدثین کے نزدیک حافظ حدیث نہیں ہیں. اور دوسرے حفاظ و ثقات کے خلاف روایت کرتے ہیں. اس لئے حسب اصطلاح محدثین اس زیادتی کو منکر کہا جاویگا اور چونکہ عروج روحانی آپ کو کئی بار ہوا ہے یعنی اس معراج سے پہلے خواب میں عروج ہوا ہے جس کی حکمت غالبًا یہ ہے کہ آہستہ آہستہ اس معراج اعظم کی صلاحیت پیدا ہوسکے اور قوت برداشت آجاوے، علاوہ ازیں استیقاظ (جو کہ استیقظت کا مصدر ہے ) اس کے معنی ہمیشہ سونے سے بیدار ہوجانے کے نہیں آتے ہیں. بلکہ اِنْتِقَالٌ مِنْ حَالٍ اِلٰی حَالٍ ( یعنی ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے ) کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔

حضرت صدیقہ طائف والوں کے واقعۂ تکذیب کو بیان کرتی ہوئی فرماتی ہیں کہ :۔

ترجمہ :۔ (تو میں غمگین واپس لوٹا اور قرن ثعالب پر مجھے ہوش آیا۔ یعنی غم کی حالت ختم ہوئی ) یہاں استفاقہ کے معنی اِنْتِقَالٌ مِّنْ حَالٍ اِلٰی حَالٍ ہی کے ہوسکتے ہیں۔

ابو اسید اپنے صغیر السن بچے کو آپ کی خدمت میں بغرض تبرک لائے. آپ کی ران پر بچے کو لٹادیا.

آپ اس وقت لوگوں کو احکام خداوندی کی تبلیغ فرما رہے تھے. ابو اسید کو کچھ دیر کے بعد خیال آیا کہ اس وقت آپ کی توجہ کو پھیرنا مناسب نہیں ہے. خاموشی کے ساتھ بچے کو اٹھالیا. (احادیث میں) اس واقعہ کے بعد ہے: ۔ ثم استیقظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جاگے) یہاں یہی معنی ہوسکتے ہیں کہ آپ پہلی حالت تَوَجُّہٌ اِلَی الْاَضْیَافِ (یعنی مہمانوں کی طرف توجہ) سے دوسری حالت (تَوَجُّہٌ اِلَی الطِّفْلِ) (یعنی بچے کی طرف توجہ) کی طرف آئے۔

پس شریک کی وجہ سے موقع تو ہے کہ ان کی تغلیط کی جاوے اور یا دوسرے معنی تجویز کئے جاویں. مگر دوسرے معنی متعین کرنا تغلیط کی نسبت سے اچھے ہیں۔ وَہٰذَا الْحَمْلُ اَحْسَنُ مِنَ التَّغْلِیْطِ. (دوسرے معنی پر محمول کرنا شریک کی تغلیط سے اچھا ہے)

لیلۃ المعراج کے وقت میں اختلاف:۔ (۱) ابن عساکر نے اسراء کی احادیث کو بعثت کے شروع میں ذکر کیا ہے (۲) ابن اسحاق نے بعثت کے تقریباً دس سال بعد ذکر کیا ہے۔ (۳) بیہقی نے بروایت زہری کہا ہے کہ مکہ کو ترک کر کے مدینے جانے کے ایک سال قبل لیلۃ المعراج ہے (۴) حاکم نے بروایت اسماعیل سُدّی بیان کیا کہ لیلۃ الاسراء میں بمقام بیت المقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پانچ نمازیں فرض ہوئیں. ہجرت سے سولہ مہینے پہلے۔ اس قول کے موافق لیلۃ الاسراء ذی القعدہ میں ہوسکے گی۔ کیونکہ ہجرت کی تاریخ ۴ ربیع الاول ہے اور زہری کے قول پر لیلۃ الاسراء ربیع الاول میں ہے۔ (۵) ابو بکر بن ابی شیبہ بروایت جابر (ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت. بعثت. معراج. ہجرت. وفات. یہ سب دوشنبہ کے دن ۱۲ ربیع الاول کو ہوئے. اور اگرچہ حافظ عبدالغنی نے اس پر اعتماد کیا ہے مگر اس سے قطع نظر نہیں کی جاسکتی ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے۔

(۶) بعض حضرات ایک اور حدیث بھی بیان کرتے ہیں کہ معراج ۲۷ رجب کو ہوئی ہے. مگر یہ حدیث یقیناً غیر صحیح ہے۔ ہمارے زمانہ کے عوام میں یہ مشہور ہوگیا کہ شب معراج رجب کی نوچندی جمعرات (ماہ رجب کی پہلی جمعرات) کو ہوئی ہے۔ اسی پر بِنَائے فَاسِدٌ عَلَی الْفَاسِدِ کے طور پر صلوٰۃِ رَغائب کی بنا رکھی گئی ہے کہ اس رات مخصوص طریقہ پر نماز پڑھی جاتی

تھی. اور جو ہمارے زمانہ کے ان مبتدعین مشائخ میں رائج ہے جو کہ اپنے آپ کو متبع سنّت کہتے ہیں۔ سنت و بدعت میں تمیز رکھنے والوں نے اس کو سختی سے رد کیا اور بدعت بتایا ہے. چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں:۔

وَ قَدْ بَسَطَ الْكَلَامُ عَلَيْهَا شَارِحَا الْمُنْيَةِ وَ صَرَّحَا بِأَنَّ مَا رُوِیَ فِيْهَا بَاطِلٌ مَوْضُوْعٌ وَ بَسَطَا الْكَلَامَ فِيْهَا خُصُوْصًا فِی الْحِلْيَةِ (ص٦٤٢ ج١)

ترجمہ:۔ صلوٰۃ رغائب کے متعلق منیہ کے دونوں شارح صاحب صغیری اور صاحب کبیری نے بہت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے. اور صاف صاف لفظوں میں فرمادیا ہے کہ اس کے استحباب کے بارے میں جو حدیث روایت کی جاتی ہے وہ باطل اور گھڑی ہوئی ہے۔

دوسری جگہ (ص٦٦٨ ج١) فرماتے ہیں۔

قَالَ ابْنُ الْحَاجِ فِی الْمِدْخَلِ وَ قَدْ حَدَثَتْ بَعْدَ اَرْبَعْمِائَةٍ وَ ثَمَانِيْنَ مِنَ الْهِجْرَةِ وَ قَدْ صَنَّفَ الْعُلَمَاءُ كُتُبًا فِی اِنْكَارِهَا وَ ذَمِّهَا وَ تَسْفِيْهِ فَاعِلِهَا وَلَا يَغْتَرُّ لِكَثْرَةِ الْفَاعِلِيْنَ لَهَا فِیْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْصَارِ

ترجمہ:۔ ابن حاج نے اپنی کتاب مِدخل میں کہا ہے کہ تقریباً پانچویں صدی کے آخر تک اس نماز کا کوئی وجود نہ تھا. اس کے بعد یہ نماز ایجاد کی گئی ہے. علماء کرام نے اس کے بارے میں متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں ایجاد کردہ نماز کو منکر کہا اور مذمت کی اور اس کے کرنے والوں کو احمق کہا. اور اس دھوکے میں کسی کو نہ آنا چاہئے کہ بہت شہروں میں اس پر عمل کرنے والے ہیں۔

اس کے معلوم ہونے کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس دورِ آخر کے مسلمان اگرچہ صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ احکام میں تساہل برتتے رہے ہیں مگر انھوں نے اپنی من گھڑت عبادتوں کے اختراع اور اُن پر عمل کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی. اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ (اے اللہ میں شیطانوں کے وساوس سے تیری پناہ چاہتا ہوں)

آبائی رسم و رواج کا وبال:۔ توحید و رسالت کچھ ایسے مسائل نہ تھے کہ ان کا سمجھنا عقول متوسط سے بالا ہوتا ، بلکہ جب تک قومی اور آبائی رسم و رواج کی پابندی کی وجہ سے التفات نہ ہوا.

لیکن ادھر لَآاِلٰہَ اِلَّا اللہ کا اعلان ہوا اُدھر ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے سوتوں کو جگا دیا. یہ لوگ خود اپنی حرکات سکنات. عبادات. ریاضات. کا محاسبہ کرتے تھے اور ان میں، کھلی ہوئی خامیاں محسوس کرتے تھے. اور ہر شخص چاہتا تھا کہ علے الاعلان وہی کہے جو ایک خدا کا مقرب اپنی زبان سے کہتا ہے اور اُس کی طرف دوسروں کو بلاتا ہے لیکن ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو مابعد پر غور کرتے تھے تو اس میں شک ہی نہ ہوتا تھا کہ اس کے بعد دوست. دشمن. اور یگانے بیگانے ہو جاویں گے اور یہ چندروزہ زندگی وبال جان بن جاوے گی۔

دلم دلدارمی جوید تنم آرام می خواہد عجائب کشمکش دارم کہ جانم مفت می کاہد

اور یہ بھی اس وقت تک تھا جب تک کہ حضرت خدیجہ اور ابو طالب زندہ تھے. لیکن جب یہ دونوں دنیا سے رخصت ہو گئے تو خدا کے اس حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی مصیبتوں کا باب ہی نیا شروع ہو گیا تھا. حتیٰ کہ اول تو فقر و مسکنت کی وجہ سے یوں ہی ایام عدیدہ تک چولہے سے دھواں نکلتا ہوا دکھائی نہ دیتا تھا کیونکہ جب پکنے کے لئے کوئی چیز ہو ویگی ہی نہیں تو چولہے میں دھواں کہاں سے آویگا. لیکن اگر اتفاق سے دو چار بوٹیاں گوشت کی مل گئیں اور ہانڈی چولہے پر پہنچ گئی تو ساتھ ہی ساتھ ہی غنڈوں کو بھی خبر ہو جاتی تھی کہ آج کچھ پک رہا ہے کسی نے دیوار پر چڑھ کر کسی نے گھر میں گھس کر ہانڈی میں کوئی نجاست جھونک دی. فاقہ پر فاقہ ہو. ہانڈی چولہے پر پہنچنے کی وجہ سے امید ہو کہ آج کچھ کھانے کو ملے گا کہ آنکھوں کے سامنے اس کو اس طرح برباد کیا جاوے کہ کوئی شخص نہ کھا سکے تو ایسی صورت میں کیسی تکلیف قلب کو ہوگی. اور ہر شخص کونسی بد دعا ہے جو نہ دیگا. لیکن اس حلم کے پہاڑ کو دیکھو کہ جزع و فزع کرنا. بد دعا کرنا تو کجا. لکڑی کے ذریعہ سے ہانڈی میں سے نجاست نکالی اور اسی طرح لکڑی میں لٹکائے ہوئے گھر سے باہر لائے اور دکھا کر کہا کہ یَابَنِیْ عَبْدِمَنَافٍ اَیُّ جِوَارٍ ہٰذَا (یعنی بنی عبد مناف کے خاندان کے لوگو! پڑوسی کے ساتھ یہ کس قسم کا برتاؤ ہے) اور اسی قدر فرما کر وہیں راستے پر ڈال دیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

# اُسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

حدیث کی مستند کتابوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و خصائل کو جمع کر کے انسانی زندگی کے ہر پہلو، ہر شعبہ اور ہر حال کے متعلق ہدایات پیش کی گئی ہیں جن سے اتباعِ سنت اور اتباعِ رسول کا صحیح مفہوم متعین ہوتا ہے


مؤلف

حضرت عارف باللہ ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ

خلیفہ مجاز

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ



ادارۃ المعارف کراچی

# حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

اور

# تاریخی حقائق

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

ادارۃ المعارف

کراچی (پاکستان)

# صاحب تصنیف

**نام:** محمد اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ بن محمد مزاج علی صاحب رحمہ اللہ۔ لقب اعزاز العلماء ہے۔

**ولادت:** بدایوں میں ۱۳۰۰ھ میں ہوئی۔

**تعلیم:** آپ نے ابتدائی تعلیم شاہجہاں پور اور میرٹھ میں حاصل کی اور دارالعلوم دیوبند سے درس نظامی کی تکمیل کی۔ آپ کے مشہور اساتذہ مفتی کفایت اللہ دہلوی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری، مولانا غلام رسول ہزاروی اور مولانا معزالدین رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں۔

**تدریس:** آپ نے مدرسہ نعمانیہ بھاگلپور، افضل المدارس شاہجہانپور اور دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے فرائض انجام دیئے اور آخری دم تک دارالعلوم دیوبند میں تدریس اور افتاء کی خدمت میں مصروف رہے۔ آپ کو شیخ الادب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

**عادات واخلاق:** آپ اونچے عالم ہونے کے باوجود تواضع انکساری اور سادگی کا ایک نمونہ تھے۔ دنیا داروں سے بے نیازی اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل حد درجہ تھا۔ ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں کی جانب سے آپ کو گراں قدر مشاہرہ پر بلایا گیا لیکن آپ نے دارالعلوم کی قلیل تنخواہ کو چھوڑ کر ان گراں قدر مشاہروں پر جانا گوارا نہیں کیا۔

**وفات:** آپ نے ۱۳/رجب بروز چہار شنبہ ۱۳۷۴ھ کو وفات پائی اور دارالعلوم کے متصل قطعہ پاکیزگان میں اسلافِ امت اور سلاطینِ علومِ دین کے پڑوس میں آپ کی تدفین ہوئی۔

**تصانیف:** حواشی وتصانیف کی فہرست اسی کتاب میں فلیپ پر ملاحظہ فرمائیں۔